الرسالہ

سرپرست
مولانا وحید الدین خاں

ڈوبے ہوئے سورج نے کسی کی راتوں کو روشن نہیں کیا ہے
مگر کتنے لوگ ہیں جو اب بھی اس پر احتجاج کر رہے ہیں کہ
گزرا ہوا تحفظاتی دوران کے لئے واپس کیوں نہیں آتا۔

شمارہ ۳۲ — زر تعاون سالانہ ۲۴ روپے — قیمت فی پرچہ
خصوصی تعاون سالانہ ایک سو روپے
جولائی ۱۹۷۹ — بیرونی ممالک سے ۱۵ ڈالر امریکی — دو روپے

اسلامی دعوت

از

مولانا وحید الدین خاں

مکتبہ الرسالہ جمعیۃ بلڈنگ قاسم جان اسٹریٹ دہلی-۶

اشاعت ۱۹۷۹ (جملہ حقوق محفوظ ہیں) قیمت دو روپے

فہرست

بسم اللہ الرحمن الرحیم

ایک پتھر دوسرے پتھر سے ٹکراتا ہے تو وقتی طور پر کچھ روشنی نکلتی ہے اور جلد ہی بجھ جاتی ہے۔ مگر سورج کی روشنی کا معاملہ اس سے مختلف ہے۔ وہ کسی دوسری چیز کے ٹکرانے سے نہیں چمکتا بلکہ خود اپنی ذات میں روشن ہے۔ وہ نور اور حرارت کے ابدی بھنڈار سے روشنی لے کر اتھاہ خلا میں جگمگا رہا ہے۔ یہی حال اسلامی تحریکوں کا ہے۔ ایک تحریک وہ ہے جو وقتی حالات کے ردعمل سے پیدا ہوئی ہو۔ دوسری تحریک وہ ہے جو خدا کے ازلی نور کے پرتو سے چمک اٹھی ہو، جو آخرت کے ابدی محاسن کا دنیوی ظہور ہو۔ بظاہر دونوں تحریکیں اسلامی تحریکیں ہیں۔ مگر حقیقت کے اعتبار سے دونوں میں اتنا ہی فرق ہے جتنا سورج میں اور پتھر کی رگڑ سے پیدا ہونے والی چنگاری میں۔ ایک انسانی ردعمل کا نتیجہ ہے، دوسری خدا سے قربت و تعلق کا ظہور۔ ایک قریبی حالات کے اثر سے پیدا ہوئی ہے، دوسری آخرت کی برتر دنیا کا انعکاس ہے۔ ایک کی رونق وقتی اور ہنگامی رونق ہے، دوسری کا حاصل ازلی اور ابدی بہشت کا دروازہ کھل جانا۔

ایجابی اسلامی تحریک براہ راست خدا اور رسول کے فیضان سے اٹھتی ہے اور ردعمل کی تحریک وقتی حالات کے اثر سے۔ دوسرے لفظوں میں، ایجابی اسلامی تحریک زمانۂ نبوت سے اپنے سفر کا آغاز کرتی ہے اور ردعمل کی تحریک اپنے قریبی زمانہ کے سیاسی یا غیر سیاسی حالات سے۔ یہ فرق دونوں قسم کی تحریکوں میں زبردست فرق پیدا کر دیتا ہے۔ بظاہر دونوں ایک ہی قسم کے دینی الفاظ بولتے ہیں۔ مگر دونوں کے ذہن میں اسلامی اصطلاحات کا مفہوم اسی طرح بدل جاتا ہے جس طرح "پاپی" کا تلفظ ایک ہندی داں کے لئے گنہ گار کا مفہوم رکھتا ہے مگر ایک انگریزی داں کے لئے وہ خشخاش (Poppy) کے ہم معنی بن جاتا ہے۔

مثلاً ایک تحریک جس نے وقتی سیاسیات سے متاثر ہو کر دین کی تعبیر کی ہو، وہ اپنی سیاسی نفسیات کی بنا پر دین کو اسٹیٹ (ریاست) کے ہم معنی سمجھے گی اور بندے اور خدا کے تعلق کو ایک ایسا تعلق بنا دے گی جس میں دین کے نام پر آدمی کے حصہ میں صرف سیاسی بحثیں آتی ہیں۔ وہ عبدیت کے لطیف تر مقامات کا تجربہ ہی نہیں کر پاتا۔ اس کے برعکس نبوت کے فیضان سے دین کا تصور لینے والا آدمی اس کو اللہ سے اس برتر تعلق کے معنی میں لے گا جہاں آدمی کی اپنی انا ختم ہو جاتی ہے اور وہ اپنی پوری ہستی کو اپنے رب کے سامنے ڈال دیتا ہے۔ اسی طرح ایسی تحریک جس نے عملیاتی مذاہب کے اثر سے اپنا دینی تصور بنایا ہو وہ ذکر کو "جاپ" کے معنی میں لے لے گی۔ جب کہ پیغمبر کے صبح و شام سے ذکر کا مفہوم اخذ کرنے والا آدمی اس کو ایک عظیم نفسیاتی تجربہ کے ہم معنی سمجھے گا۔ اس کے نزدیک ذکر اس یاد الٰہی کا نام ہو گا جو خدائے برتر کی تجلیات میں ہمہ تن غرق ہونے سے کسی بندۂ خدا کے دل میں پیدا ہوتی ہے نہ کہ کسی قسم کی الفاظ شماری کا۔ حقیقی دین سے احتساب خویش کا ذہن ابھرے گا اور سیاسی دین سے احتساب اغیار کا۔ حقیقی ذکر ہو تو وہ دلوں کو پگھلاتا ہے، جب کہ شماریاتی ذکر کی ساری توجہ اس پر ہوتی ہے کہ گنتی کا مقررہ نصاب پورا کر لے۔

دین نہ خارجی ہنگامہ آرائی کا نام ہے اور نہ طلسماتی عملیات کا۔ یہ خدا کے باغ میں خدا کا پسندیدہ پھول اگانا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ایک شخص اپنے شعور کو نفسانی آمیزشوں سے پاک کر کے اس کو ملکوتی شعور کی سطح پر پہنچائے۔ وہ اپنے وجود کو ان اعلیٰ اوصاف اور کیفیات کا مالک بنائے جو اس کو خدائے سبوح و قدوس کا ہم نشین بنانے والی ہوں، جو اس کو جنت کے پاکیزہ ماحول میں رہنے کا ابدی استحقاق عطا کر سکیں۔

توحید کی حقیقت

دین کی اصل توحید ہے۔ توحید کا مطلب ہے ایک اللہ پر اعتماد کرنا اور اسی کو اپنے خوف و محبت کے جذبات کا مرکز بنانا۔ انسان کو سوچنے اور محسوس کرنے کی جو صلاحیتیں دی گئی ہیں، وہ اپنا کوئی نہ کوئی توجہاتی مرکز چاہتی ہیں۔ آدمی فطری طور پر چاہتا ہے کہ کوئی ہو جس کی طرف وہ لپکے، جس سے وہ امید رکھے، جس کے اوپر وہ بھروسہ کرے، جس کی یاد کو وہ اپنا سرمایۂ حیات بنائے۔ آدمی اپنی ہستی کا ایک مرکز بنائے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا۔ خواہ یہ مرکز دولت و اقتدار ہو یا قبریں اور دیوی دیوتا، یا کوئی دوسری چیز۔ یہ مرکز اگر اللہ کے سوا کوئی اور ہو تو یہ شرک ہے۔ اور اگر انسان صرف اللہ رب العالمین کو اپنی ہستی کا مرکز بنائے تو اسی کو توحید کہتے ہیں۔ اسلام کا تقاضا ہے کہ آدمی اپنی توجہات کو صرف اللہ کی طرف موڑ دے۔ اس کے سوا کوئی چیز اس کے لئے مرکز توجہ کی حیثیت سے باقی نہ رہے۔

توحید کی حقیقت کو کسی ایک لفظ میں بیان نہیں کیا جا سکتا۔ تاہم قرآن سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ اللہ کے ساتھ بندے کے ایک ایسے تعلق کا نام ہے جو محبت اور خوف اور توکل کے جذبات کا مجموعہ ہوتا ہے۔ کوئی بندہ اس وقت اللہ کا موحد بنتا ہے جب کہ وہ اللہ کو اس طرح پالے کہ وہی اس کا محبوب بن جائے۔ اسی پر وہ سب سے زیادہ بھروسہ کرنے لگے۔ اس کو سب سے زیادہ جس بات کا اندیشہ ہو وہ یہ کہ کہیں اس سے کوئی ایسا فعل سرزد نہ ہو جو اس کو خدا کی رحمتوں سے محروم کر دے۔
ان تمام انسانی جذبات کے لئے صرف اللہ کو خاص کر لینے کا نام توحید ہے۔ اس سلسلہ میں یہاں قرآن سے چند آیتیں نقل کی جاتی ہیں:

وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّتَّخِذُ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اَنْدَادًا يُّحِبُّوْنَهُمْ كَحُبِّ اللّٰهِ ؕ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰهِ ؕ وَلَوْ يَرَى الَّذِيْنَ ظَلَمُوْٓا اِذْ يَرَوْنَ الْعَذَابَ اَنَّ الْقُوَّةَ لِلّٰهِ جَمِيْعًا ۙ وَّاَنَّ اللّٰهَ شَدِيْدُ الْعَذَابِ ۝

بقرہ ۱۶۵

اور بعض وہ لوگ ہیں جو اللہ کے سوا اوروں کو اس کا برابر ٹھہراتے ہیں۔ ان سے ایسی محبت رکھتے ہیں جیسی محبت اللہ سے رکھنا چاہئے اور جو لوگ ایمان والے ہیں وہ سب سے زیادہ اللہ سے محبت رکھتے ہیں۔ اور کاش یہ بے انصاف دیکھ لیں اس وقت کو جب کہ وہ عذاب کو دیکھیں گے کہ ساری طاقت صرف اللہ کے لئے ہے اور اللہ سخت عذاب دینے والا ہے۔

اَللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ؕ وَعَلَى اللّٰهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُوْنَ ۝

تغابن ۱۳

اللہ، اس کے سوا کوئی الٰہ نہیں۔ اور چاہئے کہ اللہ ہی پر بھروسہ کریں ایمان لانے والے۔

اِنَّهُمْ كَانُوْا يُسٰرِعُوْنَ فِي الْخَيْرٰتِ وَيَدْعُوْنَنَا رَغَبًا وَّرَهَبًا ؕ وَكَانُوْا لَنَا خٰشِعِيْنَ ۝

انبیاء ۹۰

وہ لوگ دوڑتے تھے بھلائیوں پر اور پکارتے تھے ہم کو امید سے اور ڈر سے اور وہ ہمارے آگے عاجزی کرنے والے تھے۔

ان آیات کے مطابق توحید، اعتقادی طور پر یہ ہے کہ آدمی سب سے زیادہ اپنے رب سے محبت کرنے لگے۔ اس کے لئے سب سے زیادہ بھروسہ کی چیز اس کا خدا بن جائے۔ اس کی امیدیں اور اس کے اندیشے اللہ کے ساتھ اس طرح وابستہ ہو جائیں

کہ وہ اپنے روز و شب کے لمحات میں اس کو بے تابانہ پکارنے لگے۔

توحید کے عملی تقاضے

توحید کے عملی تقاضوں کو دو حصّے میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ عبادات اور اخلاقیات۔ اللہ نے جو وسیع کائنات بنائی ہے، اس کی ہر چیز اپنے رب کی عبادت اور بندگی میں لگی ہوئی ہے۔ "وہ طوعاً و کرہاً" اسی دین توحید کو اختیار کئے ہوئے ہے جسے انسان کو اپنے ارادہ سے اپنی زندگی میں اختیار کرنا ہے:

اَفَغَیْرَ دِیْنِ اللّٰہِ یَبْغُوْنَ وَلَهٗۤ اَسْلَمَ مَنْ فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ طَوْعًا وَّ كَرْهًا وَّاِلَیْهِ یُرْجَعُوْنَ
آل عمران - ۸۳

کیا وہ خدا کے دین کے سوا کوئی اور دین چاہتے ہیں۔ حالاں کہ اسی کے حکم میں ہے جو کوئی آسمان اور زمین میں ہے، خوشی سے یا ناخوشی سے۔ اور سب اللہ ہی کی طرف پھیرے جائیں گے۔

درخت اور دوسری کھڑی ہوئی چیزیں اپنا سایہ زمین پر ڈال دیتی ہیں۔ اس طرح گویا وہ خدا کو سجدہ کر رہی ہیں (نحل ۴۸) یہی عبادت کی اصل حقیقت ہے۔ عبادت یہ ہے کہ آدمی اللہ کے قدموں میں اپنا سر رکھ دے۔ وہ اس کے آگے جھک جائے۔ وہ اپنے وجود کو خدا کے آگے اس طرح بچھا دے جس طرح درخت اپنے سایہ کے ساتھ زمین پر بچھ جاتا ہے۔

کائنات کی اخلاقیات کیا ہیں۔ اس کی اخلاقیات یہ ہیں کہ اس کا ہر جزء خدا کے مقررہ نقشہ پر ٹھیک ٹھیک قائم ہے (فرقان ۲) اسی کے ساتھ کائنات کا ہر جزء اس کے دوسرے اجزاء کے ساتھ پوری ہم آہنگی کے ساتھ عمل کرتا ہے (یٰس ۴۰) اپنے فرض منصبی سے بال برابر نہ ہٹنا اور دوسرے کائناتی اجزاء کے ساتھ دائمی طور پر متوافق رہتے ہوئے اپنا کام انجام دینا، یہ کائنات کا اخلاق ہے۔ یہی اخلاق آدمی کو بھی اپنی زندگی میں اختیار کرنا ہے۔ انسان کو اللہ تعالیٰ نے جو ذمہ داریاں سونپی ہیں، ان پر اسے ہر حال میں قائم رہنا ہے اور جن بھائیوں کے درمیان رہ کر اس کو زندگی گزارنی ہے ان سے کامل اتحاد اور موافقت کرتے ہوئے اپنے حصہ کا کام انجام دینا ہے۔ اس معاملہ میں انسانی معاشرہ کی مثال، حدیث کے الفاظ میں، ایک جسم کی سی ہونی چاہئے۔ جسم کا ایک حصہ جب ایک صحیح عمل کرنا چاہتا ہے تو جسم کے بقیہ تمام حصے مکمل طور پر اس کا ساتھ دیتے ہیں۔ جسم کے ایک حصہ کی آرام و تکلیف اس کے دوسرے تمام حصوں کی آرام و تکلیف ہوتی ہے۔ یہی فرض شناسی اور اجتماعیت انسان سے بھی دنیا کی زندگی میں مطلوب ہے۔

عبادت اور اخلاقیات کا یہ سبق جو کائنات کے خاموش نظام میں رکھا گیا ہے۔ یہی انسانی سطح پر پیغمبر کی زندگی میں نمایاں کیا گیا ہے۔ پیغمبر کی زندگی خدا پرستی کی عملی اور معیاری مثال ہے:

لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِیْ رَسُوْلِ اللّٰهِ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ (احزاب ۲۱) — اللہ کے رسول میں تمہارے لئے بہترین نمونہ ہے

رسول وہ کامل اور مکمل انسان ہے جس نے توحید کو اعتقادی اور عملی طور پر اس کی آخری معیاری صورت میں اپنایا — نیز اللہ تعالیٰ نے خصوصی اہتمام کے ذریعہ رسول کی زندگی کے ریکارڈ کو ہمیشہ کے لئے تاریخ میں محفوظ کر دیا۔ اب جو بندۂ خدا یہ چاہتا ہے کہ وہ اپنے رب کے یہاں اس حال میں پہنچے کہ اس کا رب اس سے راضی ہو، اس کو چاہئے کہ وہ خدا کے

دین کو خدا کی کتاب سے معلوم کرے اور پھر رسول کی سنت کی روشنی میں اس کو اپنی زندگی میں اختیار کرے۔ اس کے سوا کوئی دوسرا راستہ نہیں جو آدمی کو خدا کی پکڑ سے بچانے والا اور اس کے انعامات کا مستحق بنانے والا ہو۔

دو قسم کی زندگیاں

قرآن کی چودھویں سورہ میں شجرۂ طیبہ اور شجرۂ خبیثہ کی مثال دے کر اس حقیقت کو سمجھایا گیا ہے کہ توحید کی بنیاد پر اٹھنے والی زندگی کیسی ہوتی ہے اور شرک کی بنیاد پر اٹھنے والی زندگی کیسی ——— "کیا تو نے نہیں دیکھا کہ اللہ نے کیسی مثال بیان فرمائی ہے۔ کلمۂ طیبہ ایسا ہی ہے جیسے شجرۂ طیبہ جس کی جڑ خوب گڑی ہوئی ہو۔ اور اس کی شاخیں بلند ہوں۔ وہ خدا کے حکم سے ہر فصل میں اپنا پھل دیتا ہے۔ اللہ لوگوں کے لئے مثالیں بیان کرتا ہے تاکہ وہ سمجھیں۔ اور کلمۂ خبیثہ کی مثال ایسی ہے جیسے شجرۂ خبیثہ کہ وہ زمین کے اوپر ہی اوپر سے اکھاڑ لیا جائے۔ اس کو کچھ ٹھہراؤ نہیں۔ اللہ ایمان والوں کو مضبوط کرتا ہے مضبوط بات سے دنیا میں اور آخرت میں ۔ اور اللہ بے انصاف لوگوں کو بے راہ کر دیتا ہے اور اللہ جو چاہتا ہے کرتا ہے" (ابراہیم ۲۷-۲۴)

زمین میں دو قسم کے درخت پائے جاتے ہیں۔ ایک شیشم اور چنار جیسے درخت جو زمین میں چٹان کی طرح گڑے ہوتے ہیں اور فضا کی پہنائیوں میں اپنی شاخیں پھیلائے رہتے ہیں۔ دوسرے برساتی پودے، جو زمین کے اوپر اوپر اگ آتے ہیں اور جو بھی چاہتا ہے ان کو ہاتھ بڑھا کر اکھاڑ لیتا ہے۔ یہ دونوں قسم کے درخت گویا موحد اور مشرک کی زندگی کو علامتی طور پر بتا رہے ہیں۔ موحد انسان اس کائنات کا مطلوب "درخت" ہے۔ ایک شخص جب موحد بنتا ہے تو ساری کائنات اس کی رزق رسانی کے لئے مستعد ہو جاتی ہے۔ وہ ایک تناور درخت کی شکل میں اگنا شروع ہو جاتا ہے۔ زمین میں بھی اس کو جماؤ ملتا ہے اور آسمان تک بھی اس کی سرسبزیاں اور شادابیاں پہنچتی ہیں۔ خدا کی نصرتیں اس کے ساتھ ہوتی ہیں۔ وہ دونوں موسموں میں اپنی بہار دکھاتا ہے، دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی۔

اس کے برعکس مشرک کی زندگی گویا برساتی جھاڑ جھنکاڑ کی مانند ہے۔ وہ زمین میں بس اوپر اوپر اگ آتا ہے۔ خدا کی مدد اس کے ساتھ نہیں ہوتی۔ اس لئے نہ دنیا میں اس کو جماؤ حاصل ہوتا اور نہ آخرت کے موسم میں وہ کوئی پھل دیتا۔ اللہ تعالیٰ نے قانون امتحان کی بنا پر موجودہ دنیا میں جو مہلت دے رکھی ہے، اس کی وجہ سے اس کو وقتی طور پر زمین کی سطح پر اگنے کا موقع مل جاتا ہے۔ مگر امتحان کی مدت ختم ہوتے ہی اس کو زمین سے اکھاڑ دیا جائے گا۔ اس کے بعد اس کو آگ کی دنیا میں پھینک دیا جائے گا جہاں وہ جہنم کا ایندھن بنے۔ اور خدا کی یہ سرسبز و شاداب زمین نئے اہتمام اور سنوار کے ساتھ صرف ان لوگوں کی وراثت میں دے دی جائے گی جو موت سے پہلے کی زندگی میں سچے خدا پرست ثابت ہوئے تھے۔

موحدانہ زندگی اور مشرکانہ زندگی کا فرق اپنی کامل صورت میں اگرچہ صرف آخرت میں ظاہر ہوگا، تاہم اس کا ظہور اسی دنیا سے شروع ہو جاتا ہے۔ توحید پرست اگر تنہا ہے تو خدا کا انعام اس کو اس طرح ملتا ہے کہ باطل قوتیں، اپنی ساری کوشش کے باوجود، اس کی آواز کو مغلوب نہیں کر پاتیں، وہ نظریاتی طور پر غالب ہو کر رہتا ہے اور اگر توحید پرست قابل لحاظ تعداد میں مجتمع ہو جائیں تو ان کو زمین میں سیاسی اور سماجی غلبہ بھی دے دیا جاتا ہے۔

انسان کی منزل: جنت

اللہ نے انسان کو بہترین تخلیق پر پیدا کیا۔ پھر اس کے لیے ایک جنت بنائی کہ وہ اس میں فراغت کے ساتھ رہے۔ پھر اللہ کی حکمت مقتضی ہوئی کہ زمین کے اوپر امتحانی حالات کا پردہ ڈال دیا جائے۔ جنت کو اس نے، حدیث کے الفاظ میں، مکروہات سے ڈھانپ دیا۔ اس کے بعد اس نے انتظام کیا کہ زمین پر انسانی نسل پیدا ہو۔ وہ مختلف حالات سے گزرے تاکہ ہر ہر فرد کے بارے میں معلوم ہو کہ ان میں سے کون جنت کے ماحول میں بسانے کے قابل ہے اور کون اس قابل ہے کہ اس کو جنت کی دنیا سے باہر پھینک دیا جائے۔ اس وقت ہماری زمین اسی دور سے گزر رہی ہے۔ جب تمام لوگ اپنا اپنا تعارف پیش کر چکے ہوں گے تو امتحانی حالات ختم کر دئے جائیں گے اور جنت کی دنیا اپنی تمام تابانیوں کے ساتھ سامنے آجائے گی۔ جن لوگوں نے، موجودہ امتحانی مدت میں، اپنے آپ کو جنتی معاشرہ کا اہل ثابت کیا ہوگا وہ وہاں خدائی انتظام واہتمام کے ساتھ بسائے جائیں گے۔ اور جن لوگوں نے اپنی موجودہ زندگی سے یہ ثبوت دیا ہوگا کہ وہ جنتی معاشرہ میں بسائے جانے کی اہلیت نہیں رکھتے۔ ان کو اسفل سافلین میں پھینک دیا جائے گا جہاں وہ دائمی طور پر ایک پُرعذاب ماحول میں رہیں گے، دکھ بھری زندگی کے سوا کوئی اور زندگی ان کے لئے ممکن نہ ہوگی۔

آخرت کی مکمل دنیا کائنات کے کس مقام پر بنے گی اور اس کی متعین صورت کیا ہوگی، آج کا انسان اس کو سمجھ نہیں سکتا۔ ٹھیک ویسے ہی جیسے پیٹ کا ایک بچہ پیٹ کے باہر کی دنیا کو سمجھ نہیں سکتا۔ تاہم موجودہ دنیا میں وہ سارے اسباب موجود ہیں جن کا مطالعہ ہمارے لئے اگلی دنیا کے معاملہ کو قابل فہم بنا دیتا ہے۔ اللہ نے جس طرح موجودہ دنیا کو عدم سے بنایا، اسی طرح وہ ایک اور زیادہ بہتر دنیا کو از سر نو پیدا کر سکتا ہے۔ وہ بلاشبہ ہر چیز پر قادر ہے۔ اسی طرح اللہ اس پر بھی قدرت رکھتا ہے کہ اسی موجودہ دنیا میں ایسی مستقل تبدیلیاں پیدا کر دے کہ یہی دنیا اپنے بدلے ہوئے روپ میں جنت کی دنیا بن جائے۔ جنت کے معاملہ کو قابل فہم بنانے کے لئے ذیل کی سطروں میں اس کا ایک تصوراتی خاکہ، ثانی الذکر امکان کی روشنی میں، قرآن وحدیث کے اشارات کی مدد سے پیش کیا جاتا ہے۔

جنت کی دنیا

کائنات ایک بے پناہ حد تک وسیع کارخانہ ہے۔ کائنات کے اندر ان گنت دنیائیں ہیں اور ان میں سے اکثر ہماری زمین سے کھرب ہا کھرب گنا زیادہ بڑی ہیں۔ کائنات میں دنیاؤں کی تعداد اس سے بھی زیادہ ہے جتنی تمام سمندروں کے کنارے ریت کے ذرے۔ یہ تمام دنیائیں اپنی ساری وسعتوں کے باوجود یا تو آگ کے بہت بڑے بڑے شعلے ہیں جن کو ستارے کہا جاتا ہے یا ان میں سے کچھ خشک چٹانوں اور چٹیل ریگستانوں کی صورت میں ہیں جن کو چاند اور سیارے کہا جاتا ہے۔ اتھاہ کائنات اور اس کے اندر پھیلی ہوئی ان گنت دنیاؤں میں زمین ہی واحد کرہ ہے جو سرسبز وشاداب ہے۔ زمین ایک بے حد حسین اور مکمل دنیا ہے۔ زمین وہ واحد مقام ہے جہاں زندگی کی رونقیں ہیں، پانی اور ہوا اور سبزہ ہے۔ طرح طرح کی غذائیں ہیں۔ انسان کی تمام ضرورتوں کا سامان غیر معمولی اہتمام کے ساتھ یہاں اکٹھا کر دیا گیا ہے۔ زمین

واحد کرہ ہے، جہاں انسان ایک جگمگاتی ہوئی تہذیب بناتا ہے۔ وسیع کائنات میں زمین کے سوا کوئی دوسرا مقام نہیں جہاں تہذیب و تمدن کی تعمیر ممکن ہو۔ خلائی مسافروں نے بتایا ہے کہ خلا کے بقیہ کرے انسان جیسی زندگی کے لئے اس درجہ ناموافق ہیں کہ وہ بالکل جہنم معلوم ہوتے ہیں اور ان کے مقابلہ میں ہماری موجودہ زمین جنت۔ زمین کے سوا بقیہ کائنات میں انسان کے لئے کہیں ایک گلاس پانی بھی موجود نہیں۔ حتیٰ کہ امریکی خلاباز جس نے چاند کا سفر کیا، اس کو اس سفر میں پانی کی جگہ اپنا پیشاب صاف کرکے پینا پڑا۔

کیا عجب کہ زمین، اپنی امکانیات کے اعتبار سے، خدا کی بنائی ہوئی جنت ہو۔ جنت کی جن نعمتوں کا ذکر قرآن و حدیث میں ہے وہ سب وہی ہیں جو بہ تمام و کمال موجودہ زمین پر پائی جاتی ہیں۔ قرآن میں جنت کی تصویر موجودہ دنیا کے "پھلوں" کے مشابہ بتائی گئی ہے (بقرہ ۲۵) حدیث میں ہے کہ سیحون اور جیحون اور فرات اور نیل سب جنت کے دریا ہیں (مسلم) اس دنیا میں وہ سب کچھ انتہائی افراط کے ساتھ موجود ہے جو انسان کو خوشیوں اور کامیابیوں سے بھری ہوئی ایک زندگی بنانے کے لئے درکار ہے (ابراہیم ۳۴) مگر آج زمین کا حسن انسان کو نظر نہیں آتا۔ یہ ویسا ہی ہے جیسے کہ اللہ کی ہستی بے حد نمایاں ہے، وہ آسمان و زمین کا نور ہے۔ مگر انسان اللہ کو نہیں دیکھتا۔ اللہ نے اس زمین کو بے حد خوب بنایا ہے (الذی احسن کل شیئ خلقہ، سجدہ ۷) مگر انسان دنیا کے حسن کو نہیں دیکھ پاتا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ انسان اپنے مصنوعی خول سے باہر نکلنے کے لئے تیار نہیں ہوتا۔ آدمی کسی چیز کو جب دیکھتا ہے تو وہ اس کو اپنی "آنکھ" سے نہیں دیکھتا بلکہ اپنے "ذہن" سے دیکھتا ہے۔ اور آدمی کا حال یہ ہے کہ اس نے اپنے ذہن کو سطحیت، ظاہر پرستی، خود پسندی اور وقتی مفادات کے پردوں میں ڈھانپ رکھا ہے۔ ہر آدمی ایک بناوٹی خول میں بند ہے۔ اس صورت حال نے آدمی کو اس قابل نہیں رکھا کہ وہ اپنے آپ سے گزر کر کسی چیز کو اس کے اصلی روپ میں دیکھ سکے۔ وہ چیزوں کو خود ان کی سطح پر دیکھنے کے بجائے ان کو اپنی ذات کی سطح پر دیکھتا ہے۔ وہ ہر آن جہنمی دھوئیں میں گھرا ہوا ہوتا ہے۔ اس بنا پر وہ دنیا کی جنتی فضاؤں کو دیکھ نہیں سکتا۔ آدمی اگر اپنی ذات کے خول سے باہر آئے اور چیزوں کو خدا کی نظر سے دیکھے تو وہ دنیا کے "پھلوں" میں جنت خوشبو پائے گا اور دنیا کے "دریاؤں" میں جنت کا نظارہ کرے گا۔

تاہم اگر کوئی اپنے آپ کو اتنا اوپر اٹھائے کہ دنیا کو اس کے ربانی روپ میں دیکھ سکے تب بھی وہ اس کو برتنے اور اس سے لطف اندوز ہونے میں کامیاب نہیں ہو سکتا۔ اس کی دو خاص وجہیں ہیں۔ ایک اس لئے کہ انسان کو بربنائے امتحان جو آزادی اور اختیار دیا گیا ہے، اس کا غلط استعمال کرکے اس نے زمین کو ظلم و فساد سے بھر دیا ہے۔ (روم ۔ ۴۱) دوسرے یہ کہ اللہ نے مخصوص مصالح کی بنا پر زمینی زندگی کے اوپر کبد (بلد ۴) کا پردہ ڈال دیا ہے۔ قیامت کے بعد جب زمین کو ان دونوں کمیوں سے پاک کرکے دوبارہ سنوارا جائے گا تو وہ اسی طرح نکھر اٹھے گی جس طرح گرمیوں کے سورج سے جھلسے ہوئے اور گرد و غبار سے اٹے ہوئے درخت بارش کے بعد نکھر جاتے ہیں۔ اس وقت ہماری یہ دنیا اتنی حسین اور اتنی لذیذ ہو جائے گی "جس کو نہ کسی آنکھ نے دیکھا نہ کسی کان نے سنا اور نہ کسی دل میں اس کا خیال گزرا۔"

جنت مکروہات سے ڈھکی ہوئی ہے

۱۔ ہماری دنیا کی ایک خرابی وہ ہے جو انسان کے ہاتھوں (بما کسبت ایدی الناس) پیدا ہوئی ہے۔ یہ زمین خدا کی زمین ہے۔ اس زمین کا انتظام خدا کے وہ پاک کارندے کر رہے ہیں جن کو فرشتے کہا جاتا ہے۔ تاہم انسان کو عارضی مدت کے لئے یہاں اختیار دے دیا گیا ہے۔ اس محدود اختیار کو انسان نے نہایت بری شکل میں استعمال کیا۔ انسان نے فرشتوں کے اس اندیشہ کو بدترین شکل میں درست ثابت کیا کہ انسان کو زمین میں اختیار دیا جائے گا تو وہ زمین پر فساد کرے گا اور خون بہائے گا (بقرہ ۳۰) انسانوں کے بوائق (شر و فساد) نے خدا کی دنیا کو اس قدر آلودہ کر دیا ہے کہ کسی خدا کے بندے کے لئے یہ ممکن نہیں رہا کہ دنیا کو اس کے اصلی روپ میں پا سکے۔

انسان خدا کا پرستار بننے کے بجائے اپنی پرستش کا بت کھڑا کرتا ہے۔ وہ خدا کے بتائے ہوئے راستہ پر چلنے کے بجائے اپنی گھڑی ہوئی راہوں پر دوڑتا ہے۔ وہ کامیابی پا کر اکڑتا ہے۔ وہ اپنے بھائی کو اس کا حق دینے کے بجائے اس کو برباد کرنے کے منصوبے بناتا ہے۔ وہ خدا کے دیئے ہوئے مواقع کو حقیقی کاموں میں لگانے کے بجائے ان کو نمائشی کاموں میں برباد کرتا ہے۔ وہ کمزور کو ستاتا ہے اور جھوٹے مظاہرے کر کے حمایت حق کا کریڈٹ لیتا ہے۔ وہ کسی کی ترقی کو دیکھ کر حسد اور بغض میں مبتلا ہوتا ہے اور اس کو گرانے کی کوشش کرتا ہے۔ وہ اعتراف کے طریقہ کو چھوڑ کر ہٹ دھرمی کا طریقہ اختیار کرتا ہے۔ وہ انسانیت کے لئے جینے کے بجائے اپنی ذات کے لئے جیتا ہے۔ وہ امن کے حدود میں کام کرنے کے بجائے قتل اور توڑ پھوڑ کے ذریعہ اپنا مقصد حاصل کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ وہ اپنی بڑائی قائم کرنے کی خاطر پوری قوم اور پوری انسانی نسل کو داؤ پر لگا دیتا ہے۔ انسان کی اس قسم کی بداعمالیوں نے خشکی اور تری کو فساد سے بھر دیا ہے۔ زمین کے جنتی چہرہ کے اوپر اپنا جہنمی پردہ ڈال دیا ہے۔

۲۔ دوسری چیز دنیا کے موجودہ نظام کی محدودیت ہے۔ قرآن میں بتایا گیا ہے کہ انسان کو ہم نے رنج اور مشقت (کبد) میں پیدا کیا ہے۔ یہ اس مصلحت سے ہے کہ انسان آپے سے باہر نہ ہو۔ وہ قادر مطلق کو یاد کرتا رہے۔ دنیا میں انسان کی زندگی ایسی ہی ہے جیسے پھول کے ساتھ کانٹا۔ یہاں ہر چیز کے ساتھ ایک "کانٹا" یا کبد لگا دیا گیا ہے۔ زندگی کے ساتھ موت، جوانی کے ساتھ بڑھاپا، طاقت کے ساتھ کمزوری، صحت کے ساتھ بیماری، لذت کے ساتھ محدودیت، آرام کے ساتھ اندیشہ، خوشی کے ساتھ اکتاہٹ، عمل کے ساتھ تکان، ترقی کے ساتھ مسائل۔ دوستی کے ساتھ دشمنی، معتدل موسم کے ساتھ شدید موسم، بارش کے ساتھ طوفان، نسیم صبح کے ساتھ آندھی، تمدن کے ساتھ کثافت (Pollution) کامیابی کے ساتھ حادثہ وغیرہ۔ دنیا میں پھول کے ساتھ اس طرح "کانٹے" کی یکجائی نے دنیا کی ہر خوشی اور یہاں کی ہر لذت کو بے معنی بنا دیا ہے۔ آدمی یہاں پا کر بھی نہیں پاتا۔ آدمی یہاں کامیاب ہو کر بھی اپنی کامیابی کا لطف نہیں اٹھاتا۔ حتیٰ کہ وہ اپنی اندرونی پیچیدگیوں اور خارجی مسائل کی وجہ سے اس قابل نہیں رہ جاتا کہ دنیا کو اس کے بے آمیز روپ میں دیکھ سکے۔

اپنے آپ کو حقیقت واقعہ کے مطابق بنانے والے

قیامت خدا کا وہ منصوبہ بند دھماکا ہے جو اس لئے آئے گا کہ زمین کو ان دونوں قسم کی خرابیوں سے پاک کر دے۔ اس کے بعد یہ ہوگا کہ خدا زمین کے معاملہ کو براہ راست اپنے چارج میں لے لے گا (مریم ۴۰) خدا اپنی زمین سے خبیث انسانوں

کو نکال دے گا (انفال ۳۷) اور یہاں صرف ان طیب انسانوں کو بسائے گا جو موجودہ امتحانی مدت میں اس کا ثبوت دے چکے ہوں کہ وہ خدا کی جنتی دنیا کے شہری بننے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ قرآن میں ارشاد ہوا ہے:

وَأُزْلِفَتِ الْجَنَّةُ لِلْمُتَّقِينَ غَيْرَ بَعِيدٍ ۝ هَٰذَا مَا تُوعَدُونَ لِكُلِّ أَوَّابٍ حَفِيظٍ ۝ مَنْ خَشِيَ الرَّحْمَٰنَ بِالْغَيْبِ وَجَاءَ بِقَلْبٍ مُنِيبٍ ۝ ادْخُلُوهَا بِسَلَامٍ ۖ ذَٰلِكَ يَوْمُ الْخُلُودِ ۝ لَهُمْ مَا يَشَاءُونَ فِيهَا وَلَدَيْنَا مَزِيدٌ

ق ۳۱-۳۵

اور جنت ڈر والوں کے لئے قریب لائی جائے گی، وہ کچھ دور نہ رہے گی۔ یہ ہے جس کا وعدہ تم سے کیا جاتا تھا۔ وہ ہر ایسے شخص کے لئے ہے جو رجوع ہونے والا یاد رکھنے والا ہو۔ جو بغیر دیکھے اللہ سے ڈرتا ہو اور ایسا دل لایا جس میں رجوع ہے۔ جنت میں سلامتی کے ساتھ داخل ہو جاؤ۔ یہ دن ہے ہمیشہ رہنے کا۔ ان کے لئے وہاں سب کچھ ہے جو وہ چاہیں اور ہمارے پاس اور زیادہ بھی ہے۔

اللہ تعالٰی کو اپنی جنت میں بسانے کے لئے وہ انسان مطلوب ہے جو اللہ کو نہ دیکھتے ہوئے بھی اس طرح رہے جیسے کوئی اللہ کو دیکھ کر رہتا ہے۔ اللہ کی بڑائی اور اس کے کمالات آدمی کے ذہن پر اس طرح چھا جائیں کہ وہ ہر وقت اس کو یاد آنے لگے۔ اس کا دل خدا کی باتوں سے لبریز رہے اور اس کی زندگی خدا کے گرد گھومنے لگے۔ ایک آقا اپنے اس ملازم سے بہت زیادہ خوش ہوتا ہے جو آقا کی غیر موجودگی میں بھی مکمل طور پر اس کا وفادار بنا رہے۔ اسی طرح اللہ تعالٰی کو وہ انسان سب سے زیادہ پسند ہے جو اللہ کو نہ دیکھ کر بھی اس طرح رہتا ہو جیسے وہ اللہ کو دیکھ رہا ہے، جو اللہ کی جنت اور جہنم کو نہ دیکھتے ہوئے بھی اس طرح ان کی طرف دل لگائے رہے جیسے کہ جنت اور جہنم اس کے سامنے کھڑی ہوئی ہیں۔

جس آدمی کے اندر یہ صفات نہ ہوں وہ گویا خدا کی معیاری دنیا کے لئے بے جوڑ ہے۔ وہ ایک ایسی دنیا میں رہنے کے قابل نہیں جہاں کی ہر چیز فطرت کی صراط مستقیم پر چل رہی ہو۔ جنت کی حسین دنیا میں رہنے کا اہل وہی ہے جو خدا کو اس طرح اپنا معبود بنائے کہ وہی اس کی زندگی بن جائے۔ جو اپنے شعور کو اس حد تک ترقی دے کہ اپنے آپ کو اپنے سے الگ ہو کر دیکھنے لگے۔ جو خود مختار ہو کر بھی پابند زندگی گزارے۔ جو آزاد ہو کر بھی اپنی آزادی کو صحیح حدود میں استعمال کرے۔ یہ بلند نظری اور حقیقت پسندی کا وہ مقام ہے جہاں آدمی نفسیاتی پردوں سے باہر آ کر سوچتا ہے۔ جہاں وہ اپنے آپ کو ذاتی نگاہ سے نہیں بلکہ حقیقتِ واقعہ کی نظر سے دیکھنے لگتا ہے۔ جہاں وہ مجبور نہ ہوتے ہوئے بھی ہمہ تن اپنے آپ کو اپنے آقا کے آگے جھکا دیتا ہے۔ جہاں مخالف ترغیبات کے باوجود وہ اپنے آپ کو اللہ کے حدود پر قائم رکھتا ہے۔ جہاں ڈھٹائی کے مواقع ہوتے ہوئے بھی وہ سراپا اپنے کو حق کے آگے ڈال دیتا ہے۔ مالک کائنات کے ظہور کے بعد آدمی کا جو حال ہو گا وہ حال اس کا اسی وقت ہو جاتا ہے جب کہ مالک کائنات ابھی غیب کے پردہ میں ہے۔ آج کی دنیا میں حق پرستی اور معقولیت کی کوئی قیمت نہیں۔ آج ساری قیمت صرف طاقت میں ہے۔ جنت کی دنیا وہ دنیا ہو گی جہاں حق پرستی اور معقولیت قیمت والی چیزیں بن جائیں گی۔ اس لئے اس کا شہری وہی بن سکتا ہے جس نے موجودہ دنیا میں اپنے اندر ایسے انسان کی پرورش کی ہو جو حق کو ماننے والا اور معقولیت کو تسلیم کرنے والا ہے۔ اللہ کی ناپسندیدہ چیزیں گویا اللہ کا "شجرۂ ممنوعہ" ہیں۔ جنت میں قیام

کا اجازت نامہ اسی کو ملے گا جو دنیا میں اپنے عمل سے ثابت کرے کہ وہ آزاد اور خود مختار ہو کر بھی ممنوعہ درخت کے قریب نہیں جاتا۔ جو شخص دنیا کے امتحانی مرحلہ میں یہ ثبوت دے کہ وہ لغو اور تاثیم سے دور رہنے والا آدمی ہے، اسی سے امید کی جا سکتی ہے کہ وہ جنت کے لغو اور تاثیم سے خالی ماحول میں مناسب طور پر رہ سکے گا۔ جو شخص اس قسم کے ضبط نفس، انسانی شرافت اور بلند کرداری کا ثبوت نہ دے، اس کو جنت میں آبادی کا اہل نہیں قرار دیا جائے گا، بلکہ اس کو دور پھینک دیا جائے گا جہاں وہ محروم اور بے یار و مددگار ہو کر ابد تک عذاب سہتا رہے (انفال ۳۶)

جنت کی تعمیر

آخرت وہ دن ہے جب کہ، قرآن کے الفاظ میں، اشجار خبیثہ کو اس زمین سے اکھاڑ پھینکا جائے گا۔ اور صرف اشجار طیبہ کو یہاں باقی رہنے دیا جائے گا جو خدا کے خصوصی انتظامات کے تحت یہاں ہمیشہ کے لئے پھلیں پھولیں گے۔ زمینی جنت سے برے لوگوں کو نکالنے اور وہاں اچھے لوگوں کو بسانے کا ذکر بائبل میں ان الفاظ میں آیا ہے:

"تو بدکرداروں کے سبب سے بیزار نہ ہو۔ اور بدی کرنے والوں پر رشک نہ کر۔ کیونکہ وہ گھاس کی طرح جلد کاٹ ڈالے جائیں گے۔ خداوند میں مطمئن رہ اور صبر سے اس کی آس رکھ۔ قہر سے باز آ اور غضب کو چھوڑ دے۔ کیوں کہ بدکردار کاٹ ڈالے جائیں گے۔ لیکن جن کو خداوند کی آس ہے، ملک کے وارث ہوں گے۔ تھوڑی دیر میں شریر نابود ہو جائے گا۔ تو اس کی جگہ کو غور سے دیکھے گا، پر وہ نہ ہوگا۔ لیکن حلیم ملک کے وارث ہوں گے۔ اور سلامتی کی فراوانی سے شادماں رہیں گے۔ شریروں کے بازو توڑے جائیں گے۔ لیکن خداوند صادقوں کو سنبھالتا ہے۔ کامل لوگوں کے ایام کو خداوند جانتا ہے۔ ان کی میراث ہمیشہ کے لئے ہوگی۔ جن کو وہ برکت دیتا ہے وہ زمین کے وارث ہوں گے۔ اور جن پر وہ لعنت کرتا ہے وہ کاٹ ڈالے جائیں گے۔ بدی کو چھوڑ دے اور نیکی کر۔ اور ہمیشہ تک آباد رہ۔ کیوں کہ خداوند انصاف کو پسند کرتا ہے۔ اور اپنے مقدسوں کو ترک نہیں کرتا۔ وہ ہمیشہ کے لئے محفوظ ہیں۔ پر شریروں کی نسل کاٹ ڈالی جائے گی۔ صادق زمین کے وارث ہوں گے۔ اور اس میں ہمیشہ بسے رہیں گے۔ خداوند کی آس رکھ اور اسی کی راہ پر چلتا رہ۔ اور وہ تجھے سرفراز کر کے زمین کا وارث بنائے گا۔

(زبور، داؤد کا مزمور ۳۷)

قیامت کے دھماکے کے بعد جو دنیا بنے گی وہ ہر قسم کی محدودیت اور ناموافق حالات سے پاک ہوگی۔ حدیث میں آیا ہے:

عن ابی سعید، انّ رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم قال ینادی مناد انّ لکم ان تصحوا فلا تسقموا ابدا وانّ لکم ان تحیوا فلا تموتوا ابدا وانّ لکم ان تشبوا فلا تھرموا ابدا وانّ لکم ان تنعموا فلا تبأسوا ابدا (مسلم)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، آخرت میں ایک پکارنے والا جنت والوں سے پکار کر یہ کہے گا کہ اب تم ہمیشہ تندرست رہو گے کبھی بیمار نہ ہو گے۔ اب تم ہمیشہ زندہ رہو گے کبھی تم کو موت نہ آئے گی۔ اب تم ہمیشہ جوان رہو گے کبھی بوڑھے نہ ہو گے۔ اب تم ہمیشہ نعمتوں میں رہو گے کبھی محتاج نہ ہو گے۔

قرآن و حدیث میں کثرت سے ایسے اشارے ملتے ہیں جو بتاتے ہیں کہ کس طرح وہ تمام ناخوش گوار اور ناموافق چیزیں آخرت

کی دنیا سے حذف کر دی جائیں گی جو آج "کبد" بن کر ہم کو گھیرے ہوئے ہیں۔ موجودہ دنیا میں آدمی محنت و مشقت کے بعد کوئی چیز پاتا ہے، جنت میں صرف اشتہار (زخرف ۸۱) کسی چیز کو پانے کے لئے کافی ہوگی۔ آخرت کی دنیا ہر قسم کے دکھ اور ہر طرح کے اندیشوں سے بالکل خالی ہوگی (احقاف ۱۳) اہل جنت جب اس کو دیکھیں گے تو پکار اٹھیں گے:
الحمد للہ الذی اذھب عنا الحزن (فاطر ۳۴) سب تعریف اللہ کے لئے ہے جس نے ہم سے غم کو دور کر دیا۔ اسی کے ساتھ زمین کے امکانات کو بڑھانے کے لئے اس کو بڑا کر دیا جائے گا (وَ إِذَا الْأَرْضُ مُدَّتْ) اس کی ایک صورت یہ ہے کہ غالباً پہاڑوں اور سمندروں کو ختم کر کے پوری زمین کو سطح کر دیا جائے گا، جس کے اشارے قرآن میں متعدد مقامات پر ملتے ہیں۔ اسی کے ساتھ غالباً اس کے حجم میں بھی اضافہ کر دیا جائے گا۔ اس کی تصدیق موجودہ جغرافی مطالعہ سے بھی ہوتی ہے۔ موجودہ زمانہ میں ایک مستقل نظریہ توسیع زمین کا نظریہ (Expanding Earth Theory) کے نام سے وجود میں آیا ہے۔ جغرافی ماہرین نے اندازہ کیا ہے کہ پچھلے دو سو ملین سال میں ہماری زمین تقریباً بیس فی صد تک غبارہ کی طرح پھول گئی ہے۔ اور اب بھی پھولتی اور بڑھتی جا رہی ہے:

New Scientist, London, February 8, 1978, p. 389.

قرآن سے معلوم ہوتا ہے کہ جنت ہماری موجودہ زمین ہی پر تعمیر ہوگی (زمر ۷۴) آج یہ زمین انسان کے چارج میں ہے اس وقت خدا براہ راست اس کو اپنے قبضے میں لے لے گا (مریم ۴۰) اچھے اور برے ایک دوسرے سے الگ کر دیئے جائیں گے (روم ۱۴) اور زمین کو اللہ اپنے پسندیدہ بندوں کے حوالے کر دے گا (انبیاء ۱۰۵) اس وقت زمین براہ راست خدا کے نور سے جگمگائے گی (زمر ۶۹) زمین پر جنتی ماحول پیدا کرنے کے لئے اس میں بہت سی تبدیلیاں کی جائیں گی (ابراہیم ۴۸) اس کے اوپر سے پہاڑوں کو ختم کر کے ہموار کر دیا جائے گا (طٰہٰ ۱۰۷) دریاؤں اور سمندروں کو سطح زمین کے نیچے کر دیا جائے گا (انفطار ۳) اور اس کے بعد زیر زمین آب رسانی کا نظام قائم کیا جائے گا (تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ) زمین کا آبادی کا رقبہ موجودہ رقبہ سے کئی گنا زیادہ بڑھ جائے گا (انشقاق ۳) ساری زمین ہموار کھلی ہوئی ہو جائے گی (کہف ۴۷) سخت سردی اور سخت گرمی کو ختم کر کے موسموں کو بالکل معتدل کر دیا جائے گا (دہر ۱۳) اس قسم کی اور بہت سی خوش گوار تبدیلیاں کرنے کے بعد زمین پر نہایت عمدہ مکانات، بہترین پارکوں اور باغوں میں بنائے جائیں گے (صف ۱۲) وہاں کا ماحول بے حد ستھرا ماحول ہوگا جو ہر قسم کی لغویات و خرافات سے بالکل پاک ہوگا (واقعہ ۲۵) وہاں اللہ کی بڑائی کے سوا کسی اور کی بڑائی کا چرچا نہ ہوگا (زمر ۷۵) وہاں ہر طرف امن و سلامتی کا ماحول ہوگا (واقعہ ۲۰) وہاں عالی شان کثیر منزلہ عمارتیں ہوں گی (زمر ۲۰) اہل جنت کو ہر قسم کی شاہانہ نعمتیں اور عزت و مرتبہ حاصل ہوگا (دہر ۲۰) وہاں انسان کی تمام مطلوبہ لذتیں مزید اضافہ کے ساتھ موجود ہوں گی (حم سجدہ ۳۱) وہاں کی مشغولیتیں بھی سب کی سب فرحت بخش ہوں گی (یس ۵۵) جب زمین کا یہ نیا انتظام ہوگا تو زمین سے تمام برے انسان اکھاڑ پھینکے جائیں گے (ابراہیم ۲۶) زمین پر صرف وہ لوگ باقی رہیں گے جو موجودہ زندگی میں باقیمت ثابت ہوئے ہوں (رعد ۱۷) جنھوں نے اپنی پہلی زندگی میں عبد صالح کی حیثیت سے زندگی گزاری ہو (انبیاء ۱۰۵) اصل جنت غالباً اسی زمین پر قائم ہوگی مگر اہل جنت کی پہنچ ساری کائنات

یک ہوگی (حدید ۲۱) وہ پوری کائنات میں جہاں چاہیں گے دیکھیں گے اور جس سے چاہیں گے بات کریں گے (صافات ۵۵)
وہ جہاں چاہیں گے بآسانی جا سکیں گے (زمر ۷۴)۔ جس طرح آج کی دنیا میں پانی اور ہوا اور روشنی اور دوسرے بے شمار
سامان خدائی انتظام کے تحت مسلسل فراہم کیے جا رہے ہیں اسی طرح جنت میں انسان کی تمام مرغوب چیزیں اس کو خدائی
انتظام کے تحت فراہم ہوں گی۔

نیو انگلینڈ کے طبی جرنل (Journal of Medicine) میں ایک رپورٹ شائع ہوئی ہے۔ اس میں بتایا گیا ہے
کہ صنعتی کثافت نے امریکی باشندوں کی صحت کے لیے طرح طرح کے مسائل پیدا کر دیئے ہیں ان میں سے ایک کے الفاظ میں یہ ہے:

Industrial pollution has raised the lead content in the bodies of Americans to 500 times the human body's natural level. *The Times of India*, April 29, 1979.

انسانی جسم میں فطری طور پر جست کی جو مقدار ہوتی ہے، اس کے مقابلہ میں امریکیوں کے جسم میں پانچ سو گنا زیادہ جست ہو گیا
ہے۔ اور اس کی وجہ صنعتی کثافت ہے، اس قسم کے بے شمار مسئلے ہیں جو موجودہ زمانہ میں صنعتی کثافت نے پیدا کئے ہیں ۔
ہماری مشینی صنعت اگر ایک طرف ہماری ضرورت کے سامان تیار کرتی ہے تو اسی کے ساتھ وہ پانی کو اور فضا کو اپنی کثافتوں
سے بھر دیتی ہے۔ انسان ابھی تک ایسی ٹکنالوجی دریافت نہ کر سکا جو کثافت پیدا کئے بغیر تمدن کی گاڑی چلا سکے۔

قدرت ہماری زندگی کے تمام سامان بے حساب مقدار میں مہیا کرتی ہے اور اس کے لئے ان گنت صنعتیں چلاتی ہے۔
درخت سے لے کر زندہ اجسام تک اور ذرہ سے لے کر شمسی اور کہکشانی مجموعوں تک ہر چیز متحرک ہے، ہر چیز انتہائی پیچیدہ صنعتی
نظام ہے جو ہمارے لئے زندگی کے اسباب مہیا کرتا ہے۔ مگر اتنے بڑے پیمانہ پر صنعتی سرگرمیاں جاری ہونے کے باوجود ہمارے
لئے کوئی مسئلہ پیدا نہیں ہوتا۔ یہاں حرکت ہے مگر شور نہیں۔ یہاں سامان تیار ہو رہے ہیں مگر دھواں نہیں۔ یہاں پرانی چیزیں
نئی صورت اختیار کرتی رہتی ہیں مگر کہیں کوئی گندگی نہیں۔ اللہ کی اس عظیم الشان صنعت گاہ میں صرف چند تمدنی چیزیں
انسان کے اوپر چھوڑ دی گئی ہیں۔ مثلاً مکان، سواری، برتن، کپڑا، فرنیچر وغیرہ۔ اللہ تعالیٰ نے ہر قسم کی خام اشیاء بنائیں اور
ان کو تیار شدہ سامان کی صورت دینے کے لئے بھی اعلیٰ درجہ کے مواقع فراہم کر دئے۔ اور اس کے بعد انسان کے ذمہ یہ کام سپرد
کر دیا کہ وہ ان کو استعمال کر کے اپنے لئے تمدنی اشیاء تیار کرے۔

نظام کائنات میں انسان کی اس محدود شرکت نے خشکی اور تری کو کثافتوں سے بھر دیا ہے۔ آخرت میں جب جنتی دنیا
بنے گی تو تمدن کی تعمیر کا کام بھی اللہ براہ راست اپنے انتظام میں لے لے گا۔ آج ہم اپنے "مکانات" خود بناتے ہیں۔ اس وقت
بنے بنائے مکانات (زمر ۲۰) ہم کو خدا کی طرف سے مہیا کئے جائیں گے جس طرح آج بھی بے شمار قدرتی چیزیں بنی بنائی حالت
میں ہم کو دی جا رہی ہیں۔ اس وقت ایسی سواریاں دی جائیں گی جو بے حد تیز رفتار ہوں گی مگر وہ زمین کی مانند ہوں گی جو ہزار
میل فی گھنٹہ کی رفتار سے دوڑ رہی ہے مگر کوئی شور نہیں کرتی۔ اس وقت تمدنی کارخانے قائم ہوں گے۔ مگر وہ درخت کے
کارخانہ کی مانند ہوں گے جو فضا کو آلودہ کرنے کے بجائے اس کو آکسیجن سے معطر کرتا رہتا ہے۔ وہاں آدمی کھائے گا اور
پئے گا۔ مگر اس کا جسمانی نظام کوئی غلاظت نہیں نکالے گا۔ بلکہ پھول کے نظام کی مانند ہو گا جو اپنے اندر کی کثافت کو خوشبو
کی صورت میں خارج کرتا ہے۔ وہاں ہر قسم کی بہترین سرگرمیاں جاری ہوں گی۔ مگر وہ کسی قسم کی ناخوش گواری

پیدا نہیں کریں گی، نہ اپنے لئے اور نہ دوسروں کے لئے۔

جنت کی شہریت کس کو ملے گی

یہ حسین و لذیذ جنت جو قیامت کے بعد بننے والی ہے، اس کے شہریوں کا نام مومن و مسلم ہے۔ موجودہ زندگی اسی اہلیت کا امتحان ہے۔ یہاں لوگوں کے اعمال کے مطابق ان کا انتخاب کیا جا رہا ہے۔ جو لوگ اس بات کا ثبوت دیں کہ وہ جنت کے لطیف ماحول میں بسائے جانے کے قابل ہیں، ان کو وہاں کی شہریت عطا کی جائے گی۔ قرآن میں بتایا گیا ہے کہ جنت میں لوگوں کے منہ سے جو بات نکلے گی وہ یہ کہ خدایا! پاک ہے تیری ذات، اور آپس میں ان کی ملاقات سلام ہوگی۔ اور ان کی آخری بات یہ ہوگی کہ سب خوبی اللہ کے لئے ہے (یونس ۱۰) اس کا مطلب یہ ہے کہ جنت میں ایک طرف خدا کی بڑائی اور اس کی شکر گزاری کا ماحول ہوگا۔ لوگ اپنے رب کے لئے بہترین جذبات سے سرشار ہوں گے۔ دوسری طرف ان کے درمیان آپس میں جو فضا ہوگی وہ تمام تر سلامتی اور محبت کی فضا ہوگی نہ کہ ضد اور منافست کی۔ ایسی حالت میں جنت کی دنیا میں داخلہ کا مستحق وہی قرار پا سکتا ہے جس نے موجودہ دنیا کی امتحانی مدت میں اپنے عمل سے یہ ثبوت دیا ہو کہ وہ خدا اور اس کے بندوں کے لئے اسی قسم کے اعلیٰ جذبات و کیفیات رکھنے والا انسان ہے۔ حدیث میں ہے کہ جنت میں وہ شخص نہیں جائے گا جس کے اندر رائی کے دانہ کے برابر بھی کبر ہو۔ پوچھا گیا کہ کبر کیا ہے۔ فرمایا: حق کو نظر انداز کرنا اور لوگوں کو حقیر سمجھنا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ جنت میں حقیقتوں کے اعتراف کا اور ہر بندۂ خدا کے احترام کا ماحول ہوگا، اس لئے جنت میں آباد کاری کا مستحق وہی شخص ہو سکتا ہے جس نے آج کے امتحانی مرحلہ میں اپنے رویہ سے یہ ثابت کیا ہو کہ وہ حق کو پہچاننے والا اور اس کے آگے جھک جانے والا ہے خواہ اس کے ساتھ کوئی دباؤ شامل نہ ہو۔ اسی طرح وہ انسان کا احترام کرنے والا ہے خواہ وہ اپنے پیچھے دولت اور اقتدار کا زور نہ رکھتا ہو۔ قرآن و حدیث میں جس قسم کے لوگوں کے لئے جہنم کی وعید ہے اور جن کو جنت کی خوش خبری دی گئی ہے، وہ سب گویا وہ اوصاف ہیں جو یہ بتاتے ہیں کہ کس قسم کے لوگ جہنم میں دھکیل دئے جائیں گے اور کون سی خصوصیات رکھنے والے لوگ ہیں جو جنت کے ماحول میں رہنے کے مستحق قرار پائیں گے —— اسلام کی عبادات اور اعمال سب اسی لئے ہیں کہ وہ آدمی کا تزکیہ کر کے اس کو اس قابل بنائیں کہ وہ جنتی معاشرہ میں بسائے جانے کے قابل ہو سکے۔

ایک ہندستانی صحافی ٹوکیو گیا۔ وہاں ایک گفتگو کے دوران اس کے جاپانی دوست نے اس کو بتایا کہ دودھ کی پیداوار جو اس وقت جاپان میں ہے، اس کے لحاظ سے ہم اپنی آبادی کے صرف دو تہائی حصہ کو دودھ مہیا کر پاتے ہیں۔ ہندستانی نے فوراً کہا کہ آپ لوگ نہایت آسانی سے پوری آبادی کو دودھ فراہم کر سکتے ہیں۔ اور اس کی صورت یہ ہے کہ دودھ کی مقدار جتنی کم ہے، اتنا اس کے اندر پانی ملا دیں۔ جاپانی یہ سنتے ہی فوراً سنجیدہ ہو گیا۔ اس نے اپنے ہندستانی دوست کے کان میں چپکے سے کہا: اچھا ہوا کہ یہ بات تم نے صرف مجھ سے کہی۔ اس قسم کی تدبیر یہاں عوام میں ہرگز بیان نہ کرنا۔ ورنہ لوگ تم کو قتل کر دیں گے:

"Do not pronounce such remedies here; they will murder you": *Weekend Review*, New Delhi, October 14, 1967.

گویا ایک ایسا شخص جو غذا میں ملاوٹ کا مزاج رکھتا ہو وہ جاپانی معاشرہ میں رہنے کے قابل نہیں۔ جاپانی معاشرہ ایسے کسی آدمی کو قبول نہیں کر سکتا۔ اس چھوٹی سی مثال سے جنت کے معاملہ کو سمجھا جا سکتا ہے۔ جنت گویا قلوب سلیمہ (شعراء ۸۹) اور نفوس مطمئنہ (فجر ۲۷) کی کالونی ہے۔ وہ ایسے لوگوں کا معاشرہ ہے جو ہر قسم کی نفسیاتی پیچیدگیوں سے آزاد ہوں۔ اس لئے وہاں کی دنیا میں صرف انھیں لوگوں کو بسایا جائے گا جو دنیا کی امتحانی زندگی میں اس بات کا ثبوت دے چکے ہوں کہ وہ اپنے اندر پیچیدگیوں سے آزاد روح (Complex-free soul) رکھتے ہیں۔

جنت کا ماحول وہ ماحول ہوگا جہاں ہر طرف خدا کی حمد ہو رہی ہوگی، خدا کی کبریائی کے سوا کسی اور کی کبریائی کا وہاں وجود نہ ہوگا۔ اس لئے وہی لوگ جنت کی دنیا میں رہنے کے قابل قرار پائیں گے جو موجودہ دنیا میں خدا کی حمد اور اس کی کبریائی سے سرشار رہے ہوں۔ اپنی ذات کی کبریائی چاہنے سے جن کا سینہ خالی رہا ہو۔ جنت کی دنیا میں قول و عمل کا تضاد نہ ہوگا۔ وہاں کوئی کسی کو دھوکہ نہ دے گا۔ وہاں کوئی کسی کا استحصال کرنا نہ چاہے گا۔ وہاں کوئی کسی کو آزار نہ پہنچائے گا، اس لئے جنت کا باشندہ وہی شخص ہو سکتا ہے جس نے موجودہ زندگی میں اپنے عمل سے دکھایا ہو کہ وہ شہریت کے ان اعلیٰ معیاروں پر پورا اترتا ہے۔ جنت مکمل طور پر مثبت سرگرمیوں کی دنیا ہوگی۔ اس لئے وہاں کی بستیوں میں رہائش اختیار کرنے کا اجازت نامہ صرف انھیں لوگوں کو ملے گا جنھوں نے آج کی دنیا میں یہ ثبوت دیا ہو کہ وہ خالص مثبت مزاج رکھنے والے لوگ ہیں اور منفی اور تخریبی کارروائیوں سے کوئی لگاؤ نہیں رکھتے۔ جنت کی دنیا ایک ایسی دنیا ہے جہاں آدمی دوسروں کی شرارتوں اور نالائقیوں سے محفوظ ہوگا، اس لئے جنت کی آبادیوں میں رہنے کے قابل وہی شخص ہے جس نے دنیا میں یہ ثبوت دیا ہو کہ وہ ایک ایسا شخص ہے جو دوسروں کو اپنی شرارتوں اور نالائقیوں سے محفوظ رکھنے والا ہے۔ جنت کا ماحول خرافات سے، گندگیوں سے اور فضول چیزوں سے پاک ہوگا، اس لئے جنت کی کالونیوں میں بسانے کے لئے انھیں لوگوں کا انتخاب کیا جائے گا جو اس قسم کی بے ہودگیوں سے دور رہنے والے ثابت ہوئے ہوں۔

اہل جنت کی مثال

درخت موجودہ دنیا میں، جنت کے شہریوں کے امثال (Doubles) ہیں۔ قرآن میں ایمان کو درخت سے تشبیہ دی گئی ہے (ابراہیم ۲۴) انسانی وجود کی مثال زمین کی سی ہے۔ توحید کا عقیدہ اس زمین کے لئے بیج کی حیثیت رکھتا ہے۔ جب ایک آدمی توحید کو اپناتا ہے تو گویا وہ اپنی ہستی کی زمین پر شجرۂ طیبہ کا بیج بوتا ہے۔ اگر زمین تیار ہے تو بیج اگنا شروع ہو جاتا ہے۔ اس کی جڑیں انسان کی ہستی میں داخل ہونا شروع ہو جاتی ہیں، اس کی شاخیں اس کے وجود کے چاروں طرف ابھرنے لگتی ہیں۔ جو لوگ کامل شجر بنیں گے وہ یہاں ابدی طور پر نشوونما پائیں گے۔ اور جو جھاڑ جھنکاڑ ہوں گے ان کو اکھاڑ کر پھینک دیا جائے گا۔

درخت اس لئے وجود میں نہیں آتا کہ دوسروں کے خلاف تقریر و تحریر کی مہم چلائے اور خارجی دنیا میں نظام اشجار قائم کرنے کے لئے توڑ پھوڑ کا طوفان برپا کرے۔ گدھے اور بھیڑئیے ممکن ہے ایسا کرتے ہوں مگر درختوں کا

یہ کام نہیں۔ درخت ایک انفرادی وحدت ہے۔ اس کی اپنی خاموش دنیا ہے۔ درخت کا سارا مقصد یہ ہوتا ہے کہ وہ اپنی فطرت میں چھپی ہوئی امکانیات کو بروئے کار لائے۔ وہ زمین اور ہوا اور سورج اور دوسرے بے شمار کائناتی انتظامات سے اپنے لئے غذا حاصل کرتا ہے اور پھر اپنے کو ایک ایسے کامل وجود کی صورت میں کھڑا کرتا ہے جس کی جڑیں زمین میں گہرائی تک جمی ہوئی ہوں اور جس کی شاخیں آسمان تک پہنچ رہی ہوں۔ وہ ایک انتہائی بامعنی وجود ہوتا ہے۔ اس کی جڑوں میں کروروں بیکٹیریا اس لئے مصروف عمل ہوتے ہیں کہ ہوا سے نائٹروجن نکال کر اس کو غذا فراہم کریں۔ مگر کوئی مزدوروں کا مسئلہ (Labour problem) نہیں پیدا ہوتا۔ وہ لکڑی اور پتی اور پھول اور پھل کی تیاری کے لئے ایک عظیم الشان انڈسٹری قائم کرتا ہے۔ مگر اس کی انڈسٹری کوئی فضائی کثافت پیدا نہیں کرتی۔ اس کے برعکس اس کی "چمنیاں" تروتازہ آکسیجن نکال کر فضا کو صحت بخش ہوا سے بھر دیتی ہیں۔ درخت زمین کا حسن ہے۔ وہ ہر موسم میں پھل دیتا ہے۔ وہ بارش کے عمل میں مدد دیتا ہے۔ وہ زمین کے کٹاؤ کو روکتا ہے۔ وہ سایہ اور لکڑی اور کھاد دیتا ہے، تاہم کسی کو اس سے فخر و غرور کا تجربہ نہیں ہوتا۔ وہ کائنات کے مجموعہ میں اس طرح ہم آہنگ ہے کہ دوسروں کو اس سے صرف نفع پہنچے، کسی کو اس سے کسی تکلیف کا تجربہ نہ ہو۔ آدمی درخت پر پتھر پھینکتا ہے اور درخت اس کے بدلے میں اس کے لئے پھل گراتا ہے۔ آدمی درخت کو کاربن دیتا ہے۔ درخت اس کے بدلے میں آکسیجن لوٹاتا ہے۔ وہ ایک کھڑا ہوا باعظمت وجود ہے۔ مگر وہ اپنا سایہ زمین پر ڈال کر اپنے خالق کی کبریائی کا اعتراف کرتا ہے۔ اس کی نفع بخشیاں اس کے دشمن کے لئے بھی اسی طرح کھلی ہوئی ہیں جس طرح اس کے دوست کے لئے۔ درخت، اپنی ابتدائی صورت میں ایک معمولی مادی مجموعہ ہے۔ مگر خدا کی کائنات سے اپنا رزق لے کر، وہ اپنے آپ کو قدرت کے ایک شاہکار کی صورت میں زمین کے اوپر کھڑا کر دیتا ہے۔

درخت دنیا کی زندگی میں مومنین جنت کا تعارف ہے۔ وہ بتاتا ہے کہ وہ نفوس زکیہ کیسے ہوتے ہیں جن کو اللہ اپنی جنت کی آبادکاری کے لئے چنتا ہے۔ یہ وہ لوگ ہیں جو اپنے آپ کو ایسا بنائیں کہ ان کا سینہ اللہ کی حمد کے سوا ہر حمد سے خالی ہو۔ جو بڑائی کے بجائے عجز کو اپنا کمال سمجھتے ہوں۔ جن کے پاس دوسروں کے لئے نفع رسانی ہو نہ کہ ضرر رسانی۔ جو ہر قسم کے منفی جذبات سے پاک ہو کر خدائی زمین پر لہلہاتے ہوں۔ یہی لوگ جنت کی کالونیوں میں بسائے جائیں گے۔ اور جنت کی لطیف اور نفیس دنیا ایسے ہی لوگوں کے لئے بنائی گئی ہے۔

آخرت میں ایک طرف زمینی زندگی کو ہر قسم کی محدودیتوں سے پاک کر دیا جائے گا، دوسری طرف تمام اشجار خبیثہ (غیر صالح لوگوں) کو یہاں سے اکھاڑ پھینکا جائے گا اور صرف اشجار طیبہ (صالح لوگوں) کو یہاں آبادکاری کا موقع دیا جائے گا۔ اس وقت یہ دنیا، خدا کی مزید نعمتوں کے ساتھ، جنت کی دنیا بن جائے گی۔ ایک طرف خوف و حزن اور دوسری طرف اشجار خبیثہ کے حذف کے بعد جو دنیا بنے گی وہ ایک ایسا سرسبز و شاداب باغ ہوگا جس کو دیکھ کر آدمی کہے گا: کاش میں نے اپنا سب کچھ لٹا کر اس کو حاصل کیا ہوتا۔

دین کا ماخذ قرآن وسنت نہ کہ تاریخ

ایک شخص غریب خاندان میں پیدا ہوا۔ اس کے لئے زندگی کی صورت صرف یہ تھی کہ اپنی کوششوں پر بھروسہ کرے اور ماحول کے اندر اپنا اعتبار اور اعتماد پیدا کرکے اپنی جگہ بنائے۔ اس نے محنت اور دیانت داری کو اپنا اصول بنایا۔ اس کا طریقہ کامیاب رہا۔ اس نے اپنے عمل سے غیر معمولی ترقی حاصل کی ——— اس نے اپنے لئے بہت بڑا مکان تعمیر کیا۔ باغ اور کھیت بنائے۔ تجارتیں قائم کیں۔ اپنے ساتھی اور مددگار پیدا کئے۔ وہ شخص جس نے زندگی کا آغاز معمولی محنت مزدوری سے کیا تھا، اپنی آخر عمر میں اس نے یہ درجہ حاصل کیا کہ وہ اپنے علاقہ کا سب سے بڑا اور سب سے زیادہ با اثر آدمی بن چکا تھا۔ اس نے اپنے بچوں کو وصیت کی کہ تم لوگ ہمیشہ میری راہ پر چلنا اور بچوں نے قسم کھا کر وعدہ کیا کہ وہ ایسا ہی کریں گے۔ یہ ایک امن پسند اور تعمیری مزاج رکھنے والا آدمی تھا۔ تاہم عمر کے آخری حصہ میں کچھ مفسدین نے اس کو مقدمہ بازی میں الجھا دیا۔ دیوانی اور فوجداری دونوں قسم کے مقدمات چلنے لگے۔ یہ مقدمات ابھی جاری تھے کہ باپ کا انتقال ہو گیا۔

اب جو بچے اس شخص کے وارث بنے، ان کو اپنے سفر کا آغاز وہاں سے ملا جہاں ان کا باپ ان سے جدا ہوا تھا۔ وہ بعد کی تاریخ کے وارث تھے نہ کہ حقیقۃً باپ کے ابتدائی اصولِ حیات کے۔ باپ کے لئے زندگی محنت اور دیانت داری کا نام تھی، مگر بیٹوں کو نظر آیا کہ زندگی نام ہے مقدمہ لڑنے اور حریفوں سے ٹکراؤ کرنے کا۔ باپ نے مثبت تعمیر میں زندگی کا راز پایا تھا، بیٹوں کو اغیار کی تخریب میں زندگی کا راز دکھائی دینے لگا۔ باپ نے ساری عمر تعمیر و ترقی کے کاموں میں صرف کی تھی۔ بیٹوں نے اپنی ساری عمر اپنے مفروضہ دشمنوں سے لڑنے بھڑنے میں گزار دی۔ حتیٰ کہ باپ کا اثاثہ بھی اس میں ضائع کر دیا۔ پھر بھی وہ اپنے طور پر یہی سمجھتے رہے کہ وہ باپ کے اسوہ کی تعمیل میں ایسا کر رہے ہیں۔

ایسا ہی کچھ حال موجودہ زمانہ کی اسلامی تحریکوں کا ہے۔ اسلام کا آغاز ساتویں صدی عیسوی میں ہوا تو اس وقت وہ نام تھا تعلق باللہ کا، فکرِ آخرت کا۔ رسول خدا کے نمونہ کو سامنے رکھ کر زندگی گزارنے کا، اپنے آپ کو فرشتوں کا ہم نشین بنانے کا۔ جہنم سے ڈرنے اور جنت کا مشتاق ہونے کا، اللہ کی عبادت گزاری کا اور بندوں کے ساتھ انصاف اور خیر خواہی کا معاملہ کرنے کا۔ مگر اس آغاز کے بعد اسلام کی ایک دنیوی تاریخ بنی۔ یہ تاریخ چلتی رہی۔ حتیٰ کہ اسلام ساری دنیا میں سب سے زیادہ غالب قوت بن گیا۔ یہ صورت ایک ہزار سال تک قائم رہی۔ اس کے بعد پہیہ دوسرے رخ پر چلنا شروع ہوا۔ دوسری قوموں نے نئی نئی قوتوں سے مسلح ہو کر مسلمانوں کے اوپر غلبہ حاصل کر لیا اور ان کو ہر میدان میں پیچھے دھکیل دیا۔

اس صورت حال سے مسلمانوں کو جھٹکا لگا۔ اس کے ردعمل کے طور پر انیسویں صدی عیسوی میں مسلم ملکوں میں جوابی تحریکیں اٹھنا شروع ہوئیں۔ یہ تحریکیں بظاہر مختلف ناموں سے شروع ہوئیں۔ ان کے پروگرام بھی اکثر اوقات الگ الگ رہے مگر ایک بات سب میں مشترک تھی۔ تقریباً تمام تحریکیں ردعمل کی نفسیات کے تحت پیدا ہوئیں۔ ان کا مقصد کسی نہ کسی طور پر حملہ آور قوتوں کا مقابلہ کرنا تھا۔ بالفاظ دیگر، وہ "باپ" کی ابتدائی زندگی کے احوال سے متاثر ہو کر نہیں اٹھیں بلکہ وہ باپ کی زندگی کے آخری احوال کے اثر سے پیدا ہوئیں۔ ان کو مثبت فکر نے پیدا نہیں کیا۔ بلکہ منفی جذبات ان کے ابھرنے کا سبب بنے۔ ابتدائی

دور کے مسلمانوں کے لئے اسلام کا مطلب یہ تھا کہ اپنی زندگی کو اللہ کی مرضی پر ڈھالیں تاکہ موت کے بعد آنے والی زندگی میں خدا ان کو جنتوں میں داخل کرے۔ اس کے برعکس موجودہ زمانہ کے مسلمانوں کے لئے اسلام کا مطلب یہ بن گیا کہ دوسروں سے اپنے حقوق و مطالبات کے لئے لڑتے رہیں۔ ایک کا رخ اگر آسمانی چیزوں کی طرف تھا تو دوسرے کا رخ دنیوی چیزوں اور دنیوی حریفوں کی طرف ہو گیا۔ ان میں سے کچھ لوگوں نے اتنی معقولیت برتی کہ اس فرق کا اعتراف کرتے ہوئے انھوں نے اعلان کیا کہ ان کی تحریک ملت کے تحفظ یا اس کے دفاع کی تحریک ہے نہ کہ مطلق معنوں میں پیغمبرانہ مشن کو زندہ کرنے کی۔ تاہم بعض ایسے حوصلہ مند بھی تھے جو اس کمتر حیثیت پر قانع نہ ہوئے۔ انھوں نے کہنا شروع کیا کہ وہ جس "انقلابی" مقصد کے لئے اٹھے ہیں وہی اسلام کا اصلی اور ابدی مقصد ہے۔ تمام انبیاء اسی لئے آئے کہ باطل طاقتوں سے لڑیں اور ان سے لڑ کر اسلامی قانون کی حکومت قائم کریں۔ اس طرح مذہب امن ہی تشریح کے خانہ میں، مذہب جنگ بن گیا۔ ذاتی اصلاح کی تڑپ نے خارجی انقلاب کی تڑپ کی صورت اختیار کر لی۔ گویا بیٹوں کے لئے "مقدمہ بازی" باپ کا وقتی یا اضافی عمل نہ رہا، بلکہ وہی ان کا اصل مقصدِ حیات قرار پایا۔ یہی وہ اصل دین بن گیا جس پر خدا کے یہاں جنت اور جہنم کا فیصلہ ہوتا ہے۔

اسلام کی جدید تاریخ کا سب سے بڑا مسئلہ یہی ہے۔ لوگ اسلام کے لئے سر فروشی کر رہے ہیں حالاں کہ وہ اسلام سے بہت دور ہیں۔ وہ خدا کا نعرہ بلند کر رہے ہیں حالاں کہ وہ ابھی تک خدا سے متعارف ہی نہیں ہوئے۔ اسلام کے نام پر ایسی تحریکیں وجود میں آئی ہیں جنھوں نے کام یہ سمجھا ہے کہ وہ کسی نہ کسی مفروضہ دشمن سے ٹکراتی رہیں۔ اس ٹکراؤ کو وہ دین و ملت کا کام سمجھتی ہیں۔ کوئی بیرونی استعمار سے متصادم ہے۔ کوئی غیر مسلم اکثریت کے خلاف احتجاجی سیاست چلا رہا ہے۔ کوئی اپنے ملک کے مسلم حکمراں کو اقتدار سے ہٹانے اور اس کے ساتھیوں کو گولی مارنے میں جنت کی خوشبو پا رہا ہے۔ لڑائی والا دین ہر ایک کی سمجھ میں آ رہا ہے۔ مگر سیدھا اور سچا دین جو خدا نے اپنے رسول کی معرفت بھیجا تھا وہ کسی کی سمجھ میں نہیں آتا۔ مذکورہ مثال کے مطابق، اس کی وجہ یہ ہے کہ لوگوں نے اپنی دینی فکر کا آغاز "مقدمہ بازی" کے مرحلہ سے کیا۔ وہ "محنت اور دیانت داری" کے مرحلہ سے اپنے فکر کا آغاز نہ کر سکے۔

اس صورت حال کا سب سے بڑا نقصان یہ ہے کہ دین اختیار کرنے کے باوجود آدمی اسی اصلی چیز سے محروم رہ گیا جو دین کا حقیقی مطلوب تھا۔ اس کے نتیجہ میں دین داری ایک خارجی عمل بن گیا۔ حالاں کہ دین داری تمام تر ایک اندرونی عمل ہے۔ اب کوئی اپنے اندر جھانکنے کی ضرورت محسوس نہیں کرتا۔ البتہ دوسروں کے بارے میں گرما گرم مباحثے ہر جگہ جاری ہیں۔ اپنے قریب ایک شخص پر ظلم ہو رہا ہو گا مگر اس کی نہ اسے خبر ہو گی اور نہ اس میں اپنا حصہ ادا کرنے کی فرصت۔ البتہ دور کے مقامات پر ہونے والے واقعات سے وہ انتہائی حد تک باخبر ہو گا تاکہ ٹرنک کال کے ذریعہ اس سے رابطہ قائم کرے اور ہوائی جہاز پر اڑ کر فوراً وہاں پہنچے۔ ایسے کاموں سے کسی کو دلچسپی نہیں جن میں قلبی اہمیت ہے۔ البتہ وہ کام جن میں اخباری اہمیت (نیوز ویلو) ہے، ان کے لئے سرگرمی دکھانے میں ہر ایک دوسرے سے آگے بڑھ جانا چاہتا ہے۔ کسی کو یہ ضرورت محسوس نہیں ہوتی کہ اپنے نفس کے اندر چھپی ہوئی برائیوں سے لڑے۔ البتہ باہر کی برائیوں پر بیان دینے اور تقریر کرنے میں کوئی پیچھے نہیں رہنا چاہتا۔ اور یہ سب کچھ نتیجہ ہے دین کا صحیح تصور نہ ہونے کا۔

اسلامی جہاد کیا ہے

جہاد کو اسلام میں افضل ترین عبادت کہا گیا ہے۔ اس لئے ہر ایک اپنی سرگرمیوں کو افضل ترین عمل کا درجہ دینے کے لئے اس کو جہاد کا نام دے دیتا ہے۔ کوئی ملت کے مادی حقوق کے لئے دوسری قوموں کے خلاف احتجاج اور مطالبات کی مہم جاری رکھے ہوئے ہے اور اس کو اسلامی جہاد کہہ رہا ہے اور کوئی آزادی قوم اور استخلاص وطن کے لئے لڑائی لڑنے کو۔ کوئی حکومتِ اسلامی کے قیام کے نام پر مسلمانوں کے اندر باہمی قتل و خون جاری کرنے کو جہاد قرار دے رہا ہے اور کوئی بدعت اور مشرکانہ رسوم کے خلاف مناظرہ اور مجادلہ کرنے کو۔ کوئی دوروں اور تقریروں کے مظاہرے کرکے مجاہد اسلام کا لقب لے رہا ہے اور کوئی اسلام کو دنیوی ہنگاموں کا موضوع بنا کر۔ مگر یہ تمام صورتیں جہاد کے لفظ کو غلط استعمال کرنے کی صورتیں ہیں۔ یہ اسلامی جہاد نہیں ہے۔ بلکہ جہاد کے نام پر اسلام کو قتل کرنا ہے۔ یہ خود اللہ کی راہ کے خلاف جہاد ہے نہ کہ اللہ کی راہ میں جہاد۔

قوم و وطن کی پکار اسلام کے نزدیک جاہلیت کی پکار ہے پھر اس کو اسلامی جہاد کس طرح کہا جا سکتا ہے۔ مسلمانوں کے لئے دوسری قومیں مدعو کی حیثیت رکھتی ہیں اور مدعو اقوام سے دنیوی اجر کا طالب ہونا صریح طور پر سنت انبیاء کے خلاف ہے پھر اس قسم کے حقوق کے لئے مطالباتی مہم چلانا جہاد کس طرح ہو سکتا ہے۔ جدال اور مناظرہ سے اسلام میں صریح طور پر منع کیا گیا ہے اور حکمت اور نصیحت کے ساتھ تبلیغ کا حکم دیا گیا ہے۔ ایسی حالت میں بحث و جدال کے اکھاڑے قائم کرنا کیوں کر خدا کا مطلوبہ جہاد ہو سکتا ہے۔ اسلام کے نام پر جلسوں اور جلوسوں کی دھوم مچانا اور دنیوی نشانوں کے لئے تحریکیں برپا کرنا رسول اور اصحاب رسول کے طریقہ کے بالکل خلاف ہے۔ پھر ایسے خلاف سنت کام کو اسلامی جہاد کا نام دینا کس طرح صحیح ہوگا۔ مسلمانوں کے درمیان باہمی لڑائی کو ہر حال میں ممنوع قرار دیا گیا ہے۔ جمہور کا اتفاق ہے کہ مسلم حکمرانوں کے خلاف بغاوت کرنا اور ان کو اقتدار سے ہٹانے کے لئے جنگ کرنا حرام ہے۔ خواہ ان کی امارت بجبر قائم ہوئی ہو اور خواہ مسلم حکمراں فاسق اور ظالم ہی کیوں نہ ہو (امام نووی، شرح مسلم) ایسی حالت میں "ظالم" حکمراں کو مٹانے کے نام پر مسلمانوں کا دو حصوں میں تقسیم ہونا اور باہم ایک دوسرے کے خلاف جنگ کرنا کیوں کر وہ چیز ہو سکتی ہے جس کو جہاد فی سبیل اللہ کہا جائے۔ حدیث میں بلا شبہ ظالم سلطان کے سامنے کلمۂ حق کہنے کو افضل الجہاد بتایا گیا ہے مگر اس سے مراد ظالم حکمراں کے سامنے حق کی ایک بات کہنا ہے نہ کہ اس کو اقتدار سے بے دخل کرنے کی مہم چلانا۔

جہاد کے معنی عربی زبان میں ہیں: بھرپور کوشش کرنا، پوری طاقت صرف دینا۔ یہ لفظ، عمومی استعمال میں، ایسے موقع کے لئے بولا جاتا ہے جب کہ کسی مقصد کے حصول کے لئے اپنی ساری کوشش لگا دی جائے۔ قرآن میں ہے اقسموا باللہ جہد ایمانہم (فاطر ۴۲) یعنی بہت زور لگا کر قسم کھانا۔ و ان جاھداک علی ان تشرک بی (لقمان ۱۵) یعنی مشرکانہ طریقہ پر قائم رکھنے کے لئے بہت کوشش کرنا۔ جاھدوا فینا (عنکبوت ۶۹) یعنی اللہ کے لئے مشقتیں جھیلنا۔ لا یجدون الا جہدہم (توبہ ۷۹) یعنی محنت کی کمائی۔ ان استعمالات سے اسلامی جہاد یا جہاد فی سبیل اللہ کا مطلب

سمجھا جا سکتا ہے۔ اس کا مطلب ہے اللہ کے دین کو اختیار کرنے کے بعد اس کی راہ میں وہ ساری محنت وقوت صرف کی جائے جس کی خدا کے دین کو ضرورت ہو۔

اللہ کا دین کیا ہے۔ وہ یہ ہے کہ آدمی اللہ کو خالق اور مالک اور معبود تسلیم کرے۔ وہ اپنی محبت اور عقیدت میں خدا کے ساتھ کسی کو شریک نہ کرے۔ وہ اسی سے ڈرے اور اسی پر ہر قسم کا اعتماد کرے۔ اللہ کو آدمی جب اس طرح اپنی نفسیات میں شامل کرتا ہے تو اس کے بعد اس کے اندر ایک نئی زندگی وجود میں آتی ہے۔ اب اس کے لئے سب سے زیادہ قابل اطاعت چیز وہ ہو جاتی ہے جو اللہ کے رسول کے ذریعہ اس کو ملی ہو۔ اس کے لئے سب سے زیادہ اہم بات یہ ہو جاتی ہے کہ وہ خدا کے یہاں عزت اور خوشی پانے کو اصل کامیابی سمجھے اور دنیا کی کامیابی اس کی نظر میں بے وقعت ہو جائے۔ خدا و رسول کے بتائے ہوئے راستہ پر چلنے کو وہ جنت کی طرف چلنا سمجھتا ہے۔ اور اس کے خلاف چلتے ہوئے اس کو ایسا معلوم ہوتا ہے گویا وہ جہنم کے شعلوں کی طرف بڑھ رہا ہے۔ اس کی توجہات کا مرکز اللہ بن جاتا ہے۔ اس کی عبادتیں اللہ کے لئے خاص ہو جاتی ہیں۔ وہ اپنے اخلاق اور معاملات میں اللہ کے حرام و حلال کا لحاظ کرنے لگتا ہے۔ خدا اپنے تمام جلال و جبروت کے ساتھ اس کا نگراں بن جاتا ہے جس کی نگرانی میں وہ اپنی تمام زندگی گزارتا رہتا ہے، یہاں تک کہ مرکر اس کے پاس پہنچ جاتا ہے۔

یہ دنیا امتحان کی جگہ ہے۔ یہاں آدمی ہر وقت نفسانی ترغیبات کے زیر اثر رہتا ہے۔ اس کے علاوہ اس دنیا میں اکثر شیطان کا اور باطل پرستوں کا غلبہ رہتا ہے۔ یہی صورت حال اس چیز کی ضرورت پیدا کرتی ہے جس کو جہاد کہا گیا ہے۔ آدمی کو ہر قسم کی ترغیبات اور رکاوٹوں کا مقابلہ کرتے ہوئے دین پر قائم رہنا پڑتا ہے۔ اس کو ایک غیر خدائی دنیا میں خدا والا بن کر جینا پڑتا ہے۔ اپنے کو دیندار بنانے کے لئے اپنے کو مجاہد بنانا پڑتا ہے۔ دین پر قائم رہنے کے لئے انھیں غیر معمولی کوششوں کا نام جہاد ہے۔

قرآن میں اسلامی جہاد کا لفظ تین مواقع کے لئے استعمال کیا گیا ہے: استقامت، دعوتی جدوجہد اور قتال فی سبیل اللہ۔ جہاد اولاً اس بات کا نام ہے کہ اللہ کے دین کو اختیار کرنے میں جو مشکلات پیش آئیں ان کو جھیلتے ہوئے اپنے آپ کو دین پر قائم رکھا جائے۔ مال کا نقصان ہو تو اس کو برداشت کیا جائے۔ عزت اور حیثیت کو خطرہ ہو تو اس کو گوارا کیا جائے۔ جسمانی تکلیف پہنچے تو اس پر صبر کیا جائے۔ نفس کو روکنے اور دبانے کی ضرورت ہو تو اس سے دریغ نہ کیا جائے۔ حالات کی کوئی بھی شدت آدمی کو حق کی راہ سے ہٹانے والی ثابت نہ ہو:

مَنْ كَانَ يَرْجُوا لِقَاءَ اللَّهِ فَإِنَّ أَجَلَ اللَّهِ لَآتٍ وَهُوَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ۔ وَمَنْ جَاهَدَ فَإِنَّمَا يُجَاهِدُ لِنَفْسِهِ إِنَّ اللَّهَ لَغَنِيٌّ عَنِ الْعَالَمِينَ۔ وَالَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ لَنُكَفِّرَنَّ عَنْهُمْ سَيِّئَاتِهِمْ وَلَنَجْزِيَنَّهُمْ أَحْسَنَ الَّذِي كَانُوا يَعْمَلُونَ (عنکبوت ۷-۵)

جو شخص اللہ سے ملاقات کی امید رکھتا ہے تو اللہ کا وعدہ یقیناً آنے والا ہے اور وہ سنتا اور جانتا ہے اور جو شخص محنت اٹھائے تو وہ اپنے ہی لئے محنت اٹھاتا ہے۔ اللہ کو جہان والوں کی حاجت نہیں۔ اور جو لوگ ایمان لائے اور اچھے کام کئے تو ہم ان کی برائیاں ان سے دور کر دیں گے اور بدلہ دیں گے

ان کو بہتر سے بہتر کاموں کا۔

اس جہاد کا میدان جنگ سے کوئی تعلق نہیں۔ یہ زندگی کے ہر میدان میں ہر وقت جاری رہتا ہے۔ حضرت حسن بصری نے کہا ہے:

ان الرجل لیجاھد وما ضرب یوما من الدھر بسیف (تفسیر ابن کثیر، ثالث ۲۹)

آدمی بلاشبہ مجاہد ہوتا ہے حالاں کہ وہ کبھی ایک دن کے لئے بھی تلوار نہیں چلاتا۔

جہاد کی دوسری صورت وہ ہے جو اللہ کے پیغام کو دوسروں تک پہنچانے کے لئے کی جاتی ہے۔ یہ ایک مشکل ترین کام ہے اور سخت ترین جدوجہد کے ذریعہ اس کو انجام دینا پڑتا ہے۔ اسی لئے قرآن میں دعوتی مہم کو جہاد کہا گیا ہے:

وَلَقَدْ صَرَّفْنٰهُ بَيْنَهُمْ لِيَذَّكَّرُوْا فَاَبٰۤى اَكْثَرُ النَّاسِ اِلَّا كُفُوْرًا وَلَوْ شِئْنَا لَبَعَثْنَا فِيْ كُلِّ قَرْيَةٍ نَّذِيْرًا۔ فَلَا تُطِعِ الْكٰفِرِيْنَ وَجَاهِدْهُمْ بِهٖ جِهَادًا كَبِيْرًا۔ (فرقان ۵۲-۵۰)

اور ہم نے ان کے درمیان طرح طرح سے نصیحت بیان کی تاکہ وہ دھیان کریں۔ مگر اکثر لوگوں نے انکار ہی کیا اور اگر ہم چاہتے تو ہم ہر بستی میں کوئی ڈرانے والا اٹھاتے۔ پس تو منکروں کا کہا نہ مان اور قرآن کے ذریعہ ان پر خوب کوشش کر۔

یہ دعوت و تبلیغ امت مسلمہ کا اصل مشن ہے۔ ختم نبوت کے بعد امت کی یہ لازمی ذمہ داری ہے کہ دنیا کی تمام قوموں تک خدا کے پیغام کو پہنچائے، اس کے لئے ہر قسم کی مشقتوں کو برداشت کرے اور وقت اور مال سے لے کر جسم و جان کی تمام طاقتوں کو اس کی راہ میں لگا دے:

وَجَاهِدُوْا فِي اللّٰهِ حَقَّ جِهَادِهٖ ؕ هُوَ اجْتَبٰىكُمْ وَمَا جَعَلَ عَلَيْكُمْ فِي الدِّيْنِ مِنْ حَرَجٍ ؕ مِلَّةَ اَبِيْكُمْ اِبْرٰهِيْمَ ؕ هُوَ سَمّٰىكُمُ الْمُسْلِمِيْنَ مِنْ قَبْلُ وَفِيْ هٰذَا لِيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ شَهِيْدًا عَلَيْكُمْ وَتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ فَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ وَاعْتَصِمُوْا بِاللّٰهِ ؕ هُوَ مَوْلٰىكُمْ فَنِعْمَ الْمَوْلٰى وَنِعْمَ النَّصِيْرُ ۝ (حج آخر)

اور اللہ کے کام میں خوب کوشش کرو جیسا کوشش کرنے کا حق ہے۔ اس نے تم کو چن لیا ہے، اور دین میں تم پر کوئی تنگی نہیں رکھی۔ تمہارے باپ ابراہیم کی ملت۔ اللہ نے تمہارا نام مسلم رکھا ہے پہلے سے اور اس قرآن میں۔ تاکہ رسول تم پر بتانے والا ہو اور تم لوگوں پر بتانے والے بنو۔ پس نماز قائم رکھو اور زکوٰۃ ادا کرو اور اللہ کو مضبوط پکڑو۔ وہی تمہارا کارساز ہے۔ پس کیسا اچھا کارساز ہے اور کیسا اچھا مددگار۔

جہاد کی تیسری صورت قتال ہے۔ اہل ایمان مخالفوں کی طرف سے آئی ہوئی مصیبتوں پر صبر کرتے ہیں۔ وہ ہر طرح کی مشقتیں برداشت کرتے ہوئے دعوت الی اللہ کا کام جاری رکھتے ہیں۔ تاہم کبھی ایسا ہوتا ہے کہ منکرین حق عمومی قسم کی مخالفانہ کارروائیوں سے گزر کر جنگ و قتال کے لئے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ ایسی حالت میں جب ان کی طرف سے ابتدا (توبہ ۱۳) ہو جائے۔ (الجہاد ان تقاتل الکفار اذا لقیتم، ترغیب و ترہیب) نیز اہل اسلام اپنی تنظیم اور اپنے وسائل اور مواقع کے لحاظ سے اس پوزیشن میں ہوں کہ کامیاب دفاع کر سکیں تو وہ مخالفین کے جنگی چیلنج کا جواب میدان جنگ میں دیتے ہیں۔ یہ جنگ اہل ایمان کے لئے معروف قسم کی کوئی جنگ نہیں ہوتی۔ یہ دراصل ان کے صبر و استقامت کا ایک امتحان ہوتا ہے جو حالات کے اعتبار سے کبھی انھیں پیش آتا ہے۔ اہل ایمان اپنے ایمان پر قائم رہتے ہوئے اور اپنی

دعوتی ذمہ داریوں کو انجام دیتے ہوئے اول دن سے ایک "جنگ" سے دوچار رہتے ہیں۔ یہ جنگ ابتداءً اپنے نفس کے محرکات سے، شیطان کی ترغیبات سے اور گرد و پیش کے مخالفانہ حالات کے مقابلہ میں ہوتی ہے۔ عمومی الفاظ میں اس کو صبر کہا جاتا ہے۔ یہ صبر اور مصابرت جب بعض حالات میں شدید تر صورت اختیار کرے تو اسی کا نام جہاد ہے۔ یہ آدمی کے ایمان اور استقامت علی الحق کا شدید ترین امتحان ہے۔ اس لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ دشمن سے جنگ کی تمنا نہ کرو۔ البتہ اگر جنگ پیش آجائے تو پوری پامردی کے ساتھ مقابلہ کرو (لا تتمنوا لقاء العدو واسألوا اللہ العافیۃ فاذا لقیتم فاصبروا، متفق علیہ) جہاد بالسیف کے سلسلہ میں قرآن کی ایک آیت یہ ہے:

انفروا خفافا وثقالا وجاھدوا باموالکم وانفسکم فی سبیل اللہ ذلکم خیر لکم ان کنتم تعلمون ٥

اے ایمان والو نکلو ہلکے اور بھاری اور لڑو اپنے مال سے اور اپنی جان سے اللہ کی راہ میں۔ یہ تمہارے لئے بہتر ہے، اگر تم سمجھو۔

توبہ - ۴۱

حدیث کے الفاظ میں، جنت کو مکروہات سے ڈھانپ دیا گیا ہے۔ ایک آدمی جب جنت کی طرف اپنا سفر شروع کرتا ہے تو اس کو بے شمار قسم کے ناموافق حالات اور رکاوٹوں سے سابقہ پیش آتا ہے۔ ان دشواریوں اور ناخوش گواریوں کو عبور کرکے اپنا سفر جاری رکھنے میں جو محنت صرف کرنی پڑتی ہے اسی کا نام جہاد ہے ——

ایک شخص جب اپنے بنے ہوئے نقشہ کو توڑ کر حق کو اختیار کرتا ہے تو وہ جہاد کرتا ہے۔ جب وہ اپنے مقابلہ میں دوسرے کے فضل کا اعتراف کرنے کے لئے اپنی "انا" کو کچلتا ہے تو وہ جہاد کرتا ہے۔ جب وہ "غیب" کے فائدہ کے شوق میں ظاہری عزت اور فائدہ کو قربان کرتا ہے تو وہ جہاد کرتا ہے۔ جب وہ الفاظ کا ذخیرہ ہوتے ہوئے خدا کے خوف سے اپنی زبان کو بند کرلیتا ہے تو وہ جہاد کرتا ہے، جب وہ خدا کی خاطر شہرت کے راستوں کو چھوڑ دیتا ہے اور گمنامی کے راستوں کو اپنے لئے پسند کرلیتا ہے تو وہ جہاد کرتا ہے۔ اسی طرح پوری زندگی میں آدمی آسانی کے مقابلہ میں دشواری کو ترجیح دیتا ہے۔ وہ اپنی انا کو غذا دینے کے بجائے اپنی انا کو مارتا ہے۔ وہ مشکلات کو عذر بنانے کے بجائے مشکلات کو عبور کرنے کے لئے اپنی ساری طاقت لگا دیتا ہے۔ یہی جہاد ہے جو مومن کی پوری حیات میں جاری رہتا ہے۔ اسی جدوجہد کا ایک امکانی مرحلہ جنگ ہے۔ تاہم عام جہاد اور جنگ میں یہ فرق ہے کہ عام جہاد تو ہر حال میں اور ہر مومن کی زندگی میں ہمیشہ جاری رہتا ہے۔ جب کہ جنگ مخصوص حالات میں پیش آتی ہے اور مخصوص شرائط کی تکمیل کے بعد لڑی جاتی ہے۔ ان حالات اور ان شرائط کے بغیر اگر کوئی جنگی جہاد شروع کر دے تو وہ جہاد نہیں ہوگا بلکہ فساد ہوگا جس سے اللہ اور اس کا رسول بری ہیں۔

جہاد غیر خدا پرست دنیا میں خدا پرست بننے کی کوشش ہے۔ یہ ایک طرف اپنے آپ کو نفس اور شیطان کی ترغیبات سے روکنا ہے اور دوسری جانب خارج سے سامنے آنے والی رکاوٹوں کی مزاحمت کرتے ہوئے اپنے رب کی طرف اپنے سفر کو جاری رکھنا ہے۔ فتنوں سے بھری ہوئی دنیا میں ایک بندہ اپنے رب کے راستہ پر چلنے کے لئے جو کوشش کرتا ہے اسی کا نام جہاد ہے جو کبھی آدمی کے اپنے اندر ہوتی ہے اور کبھی اس کے باہر۔

بعض لوگوں کے نزدیک جہاد یہ ہے کہ وقت کے حکمرانوں سے لڑ کر ان سے "اقتدار کی کنجیاں" چھینی جائیں تاکہ اسلام کو ایک مکمل ریاستی نظام کی حیثیت سے زمین پر نافذ کیا جاسکے۔ مگر اس قسم کے نظریہ کا کوئی تعلق نہ اسلام سے ہے اور نہ جہاد سے۔ قرآن و حدیث کے پورے ذخیرہ میں کوئی ایک نص بھی ایسی موجود نہیں ہے جس سے اس انقلابی جہاد کا حکم نکلتا ہو۔ قرآن کے مطابق اللہ کو اصلاً جو چیز مطلوب ہے وہ یہ کہ آدمی ایمان اور عمل صالح کی زندگی اختیار کرے۔ جب ایک قابل لحاظ گروہ اس قسم کی ایک زندگی اختیار کر لیتا ہے تو بطور انعام اس کو زمین کا اقتدار بھی دے دیا جاتا ہے (نور ۵۵) مگر یہ نظریہ اپنے حصہ کا کام چھوڑ کر خدا کے حصہ کا کام انجام دینا چاہتا ہے۔

یہ نظریہ اسلام کے پورے معاملہ کو الٹ دیتا ہے۔ وہ اسلام کو عملاً ایک قسم کے سیاسی عمل کا عنوان بنا دیتا ہے جس طرح، مثال کے طور پر، کمیونزم بنا ہوا ہے۔ اسلام یہ چاہتا ہے کہ انسان کی تمام سرگرمیوں کا رخ آخرت کی طرف ہو۔ وہ ہمہ تن اگلی دنیا کی طرف متوجہ ہو جائے۔ مگر یہ نظریہ انسانی سرگرمیوں کو موجودہ دنیا کی طرف متوجہ کر دیتا ہے۔ اس کے نتیجہ میں آخرت رخی زندگی کے بجائے دنیا رخی یا سیاست رخی زندگی وجود میں آتی ہے۔ آدمی آخرت کے عذاب سے نجات پانے کے لئے فکرمند ہونے کے بجائے دنیا میں سیاسی انقلاب برپا کرنے کو اپنی توجہات کا مرکز بنا لیتا ہے۔ اسی طرح اس نظریہ کے نتیجہ میں ایسا ہوتا ہے کہ احتساب خویش کے بجائے "احتساب کائنات" آدمی کا نصب العین بن جاتا ہے۔ آدمی کی کوششوں کا نشانہ اس کی اپنی ذات کے بجائے خارجی دنیا ہو جاتی ہے۔ وہ اپنی اصلاح کے لئے بے تاب ہونے کے بجائے وقت کے حکمرانوں سے لڑنے کو سب سے بڑا کام سمجھ لیتا ہے تاکہ ان سے اقتدار کی کنجیاں " چھین لے اور اسلام کو تمام شعبہ ہائے زندگی میں نافذ کر دے۔

یہ "مکمل اسلام" اس قدر ناقص اسلام ہے کہ اسلام کا کوئی ایک جزء بھی اس کے اندر صحیح طور پر اپنی جگہ نہیں پاتا۔ افراد کے اندر سیاسی مزاج پیدا کر کے وہ آدمی کو اس کی سب سے بڑی نعمت (اللہ کی قربت) سے محروم کر دیتا ہے۔ ایسے آدمی کا ذہن بے معنی سیاسی بحثوں میں مشغول ہوتا ہے نہ کہ یاد الٰہی میں۔ ایسے لوگوں کا نشانہ عین اپنے مزاج کے تحت حکومت بن جاتی ہے۔ موقع پاتے ہی وہ حکمراں گروہ کے مقابلہ میں حزب مخالف کا کردار ادا کرنے کھڑے ہو جاتے ہیں اور ملت کو دو متحارب گروہوں میں بانٹ کر پورے ملک کو قتل اور فساد سے بھر دیتے ہیں۔ سب سے زیادہ برا پھل جو اس نام نہاد مکمل اسلام سے نکلتا ہے وہ دین حق کی الٹی شہادت ہے۔ اللہ کا دین اللہ کے بندوں کے لئے رحمت ہے۔ وہ اس لئے آیا ہے کہ آدمی کو جنت کی فضاؤں کا تعارف کرائے۔ مگر اس نظریہ کے نتیجہ میں دین کی جو تصویر بنتی ہے وہ یہ کہ دین نام ہے آپس کی لڑائی کا، دین کے نام پر دنیوی ہنگامے کرنے کا۔ کوڑا مار سیاست اور گولی مار حکومت کا۔ یہ تصویر اتنی قبیح ہوتی ہے کہ لوگ پکار اٹھتے ہیں ——— "اگر اسی کا نام اسلام ہے تو غیر اسلام ہمارے لئے زیادہ اچھا ہے"۔



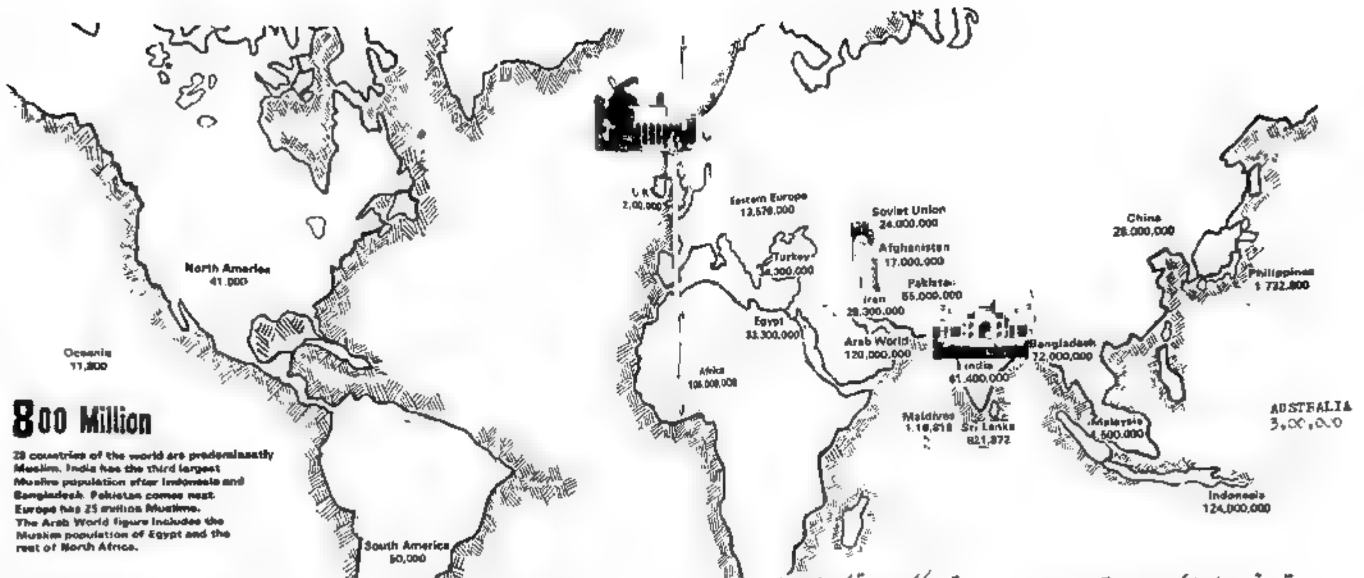
تقریباً ۳۰ سال پہلے کی بات ہے۔ راقم الحروف نے کسی مسلم اخبار میں ایک تصویر دیکھی۔ یہ تصویر بیت المقدس کی تھی۔ اس تصویر کے نیچے جلی حرفوں میں لکھا ہوا تھا:

"ارضِ مقدس جس پر چالیس کروڑ مسلمانوں کی جانیں قربان ہیں"

اس میں شک نہیں کہ مسلمانوں نے، پچھلے برسوں میں، بے شمار تعداد میں ارض مقدس پر اپنی جانیں قربان کر دی ہیں۔ مگر عملاً نتیجہ بالکل برعکس نکلا۔ ۳۰ سال پہلے ارض قدس کی جتنی زمین یہودیوں کے قبضہ میں تھی، آج اس کے مقابلہ میں کئی گنا زیادہ رقبہ پر وہ اپنا اقتدار قائم کر چکے ہیں۔ مزید حیرت یہ ہے کہ اس تیس سالہ مدت میں مسلمانوں کی تعداد ساری دنیا میں ۴۰ کروڑ سے بڑھ کر ۸۰ کرور ہو چکی ہے۔ مگر اپنے "دشمنوں" کے مقابلہ میں وہ کہیں بھی کوئی حقیقی کامیابی حاصل نہ کر سکے۔

تعداد کی کثرت اور تحریکوں کے ہجوم کے باوجود مسلمان کیوں ناکام ہو رہے ہیں۔ اس کی وجہ صرف ایک ہے۔ وہ یہ کہ وہ اپنے اصل فریضۂ منصبی کو ادا نہیں کر رہے ہیں۔ مسلمان کے ساتھ خدا کے تمام اجتماعی وعدے اس شرط پر ہیں کہ وہ دنیا میں اُس اجتماعی کام کو انجام دیں جس کے لئے انھیں چنا گیا ہے۔ اگر وہ اس کام کے لئے نہ اٹھیں تو وہ خدا کی نظر میں مجرم ہیں۔ دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی۔

یہ کام کیا ہے۔ یہ کہ وہ تمام انسانوں کو اللہ کا پیغام پہنچائیں۔ پیغام رسانی کا یہ کام کوئی قومی کام نہیں ہے۔ نہ اس کا سیاسی اور اقتصادی مفادات سے کوئی براہ راست تعلق ہے۔ یہ ایک خالص خدائی اور اخروی کام ہے۔ اللہ تعالے نے انسان کو امتحان کے لئے پیدا کیا ہے۔ دنیا میں ایک وقت تک زندگی کا موقع دینے کے بعد وہ تمام انسانوں کو آخرت میں حاضر



800 Million

28 countries of the world are predominantly Muslim. India has the third largest Muslim population after Indonesia and Bangladesh. Pakistan comes next. Europe has 25 million Muslims. The Arab World figure includes the Muslim population of Egypt and the rest of North Africa.

تقریباً ۳۰ سال پہلے کی بات ہے۔ راقم الحروف نے کسی مسلم اخبار میں ایک تصویر دیکھی۔ یہ تصویر بیت المقدس کی تھی۔ اس تصویر کے نیچے جلی حرفوں میں لکھا ہوا تھا:

"ارضِ مقدس جس پر چالیس کروڑ مسلمانوں کی جانیں قربان ہیں"

اس میں شک نہیں کہ مسلمانوں نے، پچھلے برسوں میں، بے شمار تعداد میں ارضِ مقدس پر اپنی جانیں قربان کر دی ہیں۔ مگر عملاً نتیجہ بالکل برعکس نکلا۔ ۳۰ سال پہلے ارضِ قدس کی جتنی زمین یہودیوں کے قبضہ میں تھی، آج اس کے مقابلہ میں کئی گنا زیادہ رقبہ پر وہ اپنا اقتدار قائم کر چکے ہیں۔ مزید حیرت یہ ہے کہ اس تیس سالہ مدت میں مسلمانوں کی تعداد ساری دنیا میں ۴۰ کروڑ سے بڑھ کر ۸۰ کروڑ ہو چکی ہے۔ مگر اپنے "دشمنوں" کے مقابلہ میں وہ کہیں بھی کوئی حقیقی کامیابی حاصل نہ کر سکے۔

تعداد کی کثرت اور تحریکوں کے ہجوم کے باوجود مسلمان کیوں ناکام ہو رہے ہیں۔ اس کی وجہ صرف ایک ہے۔ وہ یہ کہ وہ اپنے اصل فریضۂ منصبی کو ادا نہیں کر رہے ہیں۔ مسلمان کے ساتھ خدا کے تمام اجتماعی وعدے اس شرط پر ہیں کہ وہ دنیا میں اس اجتماعی کام کو انجام دیں جس کے لئے انھیں چنا گیا ہے۔ اگر وہ اس کام کے لئے نہ اٹھیں تو وہ خدا کی نظر میں مجرم ہیں۔ دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی۔

یہ کام کیا ہے۔ یہ کہ وہ تمام انسانوں کو اللہ کا پیغام پہنچائیں۔ پیغام رسانی کا یہ کام کوئی قومی کام نہیں ہے۔ نہ اس کا سیاسی اور اقتصادی مفادات سے کوئی براہ راست تعلق ہے۔ یہ ایک خالص خدائی اور اخروی کام ہے۔ اللہ تعالیٰ نے انسان کو امتحان کے لئے پیدا کیا ہے۔ دنیا میں ایک وقت تک زندگی کا موقع دینے کے بعد وہ تمام انسانوں کو آخرت میں حاضر

کرے گا اور وہاں ان کے عمل کے مطابق ان کے لئے دائمی جنت یا دائمی جہنم کا فیصلہ کرے گا۔

خدا اگرچہ اپنے بندوں کے احوال سے خوب واقف ہے مگر اس نے اپنی اس عدالت کے لئے جو طریقہ مقرر کیا ہے وہ یہ ہے کہ ہر زمانہ میں خود انسانوں میں ایسے لوگ اٹھیں جو خدا کی طرف سے لوگوں کو آنے والے یوم الحساب سے باخبر کریں۔ یہ لوگ جو دنیا میں قوموں کو خدا کا پیغام پہنچا رہے ہیں وہی آخرت میں ان کے اوپر خدا کے گواہ بنیں گے۔ وہ آخرت کی عدالت میں کھڑے ہو کر کہیں گے کہ کس نے پیغامِ خداوندی کو مانا اور کس نے اس کا انکار کیا۔ ان کی گواہی کے مطابق خدا ہر ایک کے اوپر اپنا فیصلہ صادر کرے گا۔

مسلمانوں کا اصل جرم یہ ہے کہ وہ اپنی اس حیثیت کو بھول گئے ہیں۔ وہ قوموں کے اوپر خدا کے گواہ بن کر نہیں کھڑے ہو رہے ہیں۔ خدا کو اپنی سنت کے مطابق اپنی عدالت کے لئے گواہ مطلوب ہیں (وَيَتَّخِذَ مِنْكُمْ شُهَدَاءَ، آل عمران ۱۴۰) مگر سارا عالمِ اسلام اس ذمہ داری کو بھولا ہوا ہے۔ وہ اس خدائی منصوبہ میں اپنے کو شامل نہیں کر رہا ہے۔ اس صورت حال نے مسلمانوں کو مجرم کے کٹہرے میں کھڑا کر دیا ہے، بجائے کہ وہ خدائی نصرتوں کے مستحق قرار پائیں۔

پچھلے برسوں میں پٹرول کی قدرتی طاقت نے بلاشبہ مسلم دنیا کو کافی سہارا دیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ خداداد خزانہ اگر ظاہر نہ ہوا ہوتا تو مسلمان، عالیہ صدیوں میں اپنی بے حساب نادانیوں کی وجہ سے، آج بین اقوامی اچھوت کی سطح پر پہنچ چکے ہوتے۔ ہماری نام نہاد انقلابی تحریکیں کسی بھی درجہ میں ہم کو بچانے والی ثابت نہیں ہو سکتی تھیں۔

اسلام اور سیاست

دین میں بگاڑ کی جو صورتیں ہیں ان میں سے ایک وہ ہے جس کو قرآن میں مضاہاۃ (توبہ ۳۰) کہا گیا ہے۔ مضاہاۃ کے معنی ہیں مشابہت۔ عربی میں کہتے ہیں ھو ضھیاؤ (وہ تمہارا ہم شکل ہے) اس سے مراد ہے: گمراہ قوموں کے نظریات و عقائد سے متاثر ہو کر دینی تعلیمات کو ان کے ہم رنگ بنا کر پیش کرنا۔ یہود کا اپنے نبی عزیر (عزرا) کو ابن اللہ (خدا کا فرزند مجازی) کہنا یا عیسائیوں کا اپنے نبی مسیح کو ابن اللہ (خدا کا فرزند مجازی یا فرزند حقیقی) قرار دینا اس کی مثالیں ہیں۔ مشرک قوموں میں باری تعالیٰ کی تجسیم یا حلول کا عقیدہ قدیم زمانہ سے چلا آرہا ہے۔ ہندوستان میں اس کا نمونہ اوتار کا عقیدہ ہے یعنی خدا کا انسانی روپ میں ظاہر ہونا۔ یہودیوں اور عیسائیوں نے اپنے انبیاء کو عظمت دینے کے لئے ان کو انھیں الفاظ اور اصطلاحات میں بیان کرنا شروع کیا جن الفاظ اور اصطلاحات میں مشرک قومیں اپنے بڑوں کی عظمت بیان کرتی تھیں۔ ان قوموں نے اپنے بزرگوں یا بادشاہوں کی عظمت بتانے کے لئے کہا کہ وہ خدا کا تجسد (Incarnation) ہیں۔ یہود و نصاریٰ نے کہنا شروع کیا کہ حضرت عزیر اور حضرت مسیح اللہ کے فرزند ہیں۔ اللہ ان کی شکل میں دنیا کی زندگی میں ظاہر ہوا ہے۔

اسلام کی سیاسی تعبیر

خدا کے دین میں بگاڑ کی یہ صورت ہر زمانہ میں پائی گئی ہے اور موجودہ زمانہ میں بھی پائی جاتی ہے۔ جو لوگ دین کو خدائی عظمتوں کی سطح پر پائے ہوئے نہ ہوں وہ اس کو دنیوی عظمتوں کی سطح پر اتارنے کی کوشش کرتے ہیں۔ دوسری عالمی جنگ کے بعد جب اشتراکی نظریات کو بہت زیادہ فروغ ہوا تو کچھ لوگوں نے سمجھا کہ اسلام کی عظمت کا سب سے بڑا ثبوت یہ ہے کہ اس کو اشتراکیت کے مطابق ثابت کیا جائے۔ اسی زمانہ میں "اسلامی سوشلزم" کی اصطلاح وضع ہوئی۔ حتیٰ کہ کہا گیا کہ تاریخ کے سب سے پہلے اشتراکی حضرت محمدؐ تھے۔

جو لوگ کیفیاتی سطح پر حقیقت کو پائے ہوئے نہ ہوں وہ حقیقت کو کمیاتی زبان میں بیان کر کے اس کو اپنے لئے قابل فہم بنانے کی کوشش کرتے ہیں۔ اسلام کو سیاسی اصطلاحات میں بیان کرنا بھی اسی کی ایک مثال ہے۔ موجودہ زمانہ میں جب سیاسی نظریات کو فروغ ہوا تو کچھ لوگوں کو نظر آیا کہ اسلام کی شان کو نمایاں کرنے کی سب سے اعلیٰ صورت یہ ہے کہ اسلام کو ایک مکمل سیاسی نظام کے روپ میں پیش کیا جائے۔ اس آخری فکر کو موجودہ زمانہ میں اسی طرح مقبولیت حاصل ہوئی جس طرح قدیم زمانہ کے عیسائیوں میں تثلیث کے نظریہ کو ہوئی، جس کو مسیحی متکلمین نے یونانیوں کے "اقانیم ثلاثہ" کے جواب میں وضع کیا تھا۔ موجودہ زمانہ میں اسلام کی سیاسی تشریح کی مقبولیت کی دو بڑی وجہیں تھیں۔ ایک یہ کہ یہ تشریح اسلام کو زمانہ کے با عظمت نظریہ کے لباس میں دکھا رہی تھی۔ دوسری وجہ ردعمل کی نفسیات تھیں۔ موجودہ زمانہ میں مسلمانوں کو مختلف قوموں سے جو سیاسی مقابلہ پیش آیا، اس کا قدرتی نتیجہ تھا کہ ان کے اندر جوابی سیاسی مزاج پیدا ہو۔ چنانچہ مسلمانوں کے درمیان مختلف عنوانات کے تحت سیاسی تحریکیں اٹھ کھڑی ہوئیں۔ اسلام کا سیاسی نظام کا تصور ان تمام تحریکوں کے لئے فکری سہارا بن گیا۔ اسلام کا سیاسی تصور موجودہ زمانہ کے بہت سے لوگوں کے نزدیک اسلام کے حق میں وقت کا ایک قصیدہ بھی تھا

اور ان کی ردعمل کی نفسیات کے لئے فکری تسکین کا ذریعہ بھی۔

موجودہ زمانہ کی مسلم تاریخ کا سب سے بڑا المیہ یہ ہے کہ ہمارے یہاں جو تحریکیں اٹھیں وہ زیادہ تر خارجی حالات، خاص طور پر سیاسی حالات، کے ردعمل کے طور پر اٹھیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اسلام کے احیاء کی کوششیں سیاسی مقابلہ آرائی کی سمت میں چل پڑیں۔ اس عملی غلطی کے ساتھ جو فکری غلطی پیش آئی اس نے معاملہ کی سنگینی کو بہت زیادہ بڑھا دیا۔ دین کو وقت کے اسلوب میں بیان کرنے کی کوششوں نے بالآخر دین کی سیاسی تعبیر کا رخ اختیار کر لیا۔ ٹھیک ویسے ہی جیسے انیسویں صدی کے یورپ میں صنعتی مزدوروں کے مسئلہ کو حل کرنے کی کوششوں میں بالآخر مارکسزم کی مادی تعبیر تاریخ وجود میں آئی۔ بندے اور خدا کا تعلق جو حقیقۃً ایک ملکوتی تعلق تھا، اس نے ایک قسم کے سیاسی تعلق کی صورت اختیار کر لی۔ اسلام سیاسی ہنگامہ آرائیوں کا عنوان بن گیا۔ جب کہ اسلام فی الحقیقت یہ ہے کہ بندے اور خدا کے درمیان وہ نفسیاتی تعلق قائم ہو جب کہ بندہ اپنے رب میں جینے لگے، وہ آخرت کی فضاؤں میں سانس لینے لگے۔ اس کے اندر وہ ملکوتی انسان جنم لے جو اس کو جنت کی ابدی دنیا کا شہری بنا سکے۔

وقت کے اسلوب میں دین کو بیان کرنا جتنا ضروری ہے، وقت کے فکر میں دین کو ڈھالنا اتنا ہی غلط ہے۔ اول الذکر تجدید دین ہے اور ثانی الذکر تحریف دین۔ ہر دور کی اپنی ایک زبان ہوتی ہے۔ ہر دور میں کچھ الفاظ اور کچھ اسلوب ہوتے ہیں جن میں آدمی سوچتا ہے، جن میں اپنے خیالات کا اظہار کرتا ہے۔ جب زمانہ بدلتا ہے تو الفاظ سے ذہن کا رشتہ ٹوٹ جاتا ہے۔ ایک لفظ جو قدیم دور میں انسان کی نفسیات کو متحرک کرتا تھا، نئے دور میں وہ لفظ اپنی یہ انقلابی قیمت کھو دیتا ہے۔ اس وقت ضرورت ہوتی ہے کہ ذہن اور الفاظ کے درمیان دوبارہ رشتہ قائم کیا جائے۔ تاہم یہ "جدت" صرف الفاظ اور اسلوب کے اعتبار سے ہوتی ہے، نہ کہ فکر کے اعتبار سے۔

اسلامی تحریک کیا ہے

اسلامی تحریک انسانی باغبانی کی تحریک ہے۔ جس طرح باغبان ایک ایک پودے پر انفرادی توجہ دے کر اس کو پورا درخت بنانے کی کوشش کرتا ہے، اسی طرح اسلامی تحریک بھی فرد فرد کو نشانہ بناتی ہے۔ اس کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ ہر وہ شخص جو زمین پر پیدا ہوا ہے، وہ سچے معنوں میں اللہ کا بندہ بنے اور اپنے اندر وہ خصوصیات پیدا کرے جو اس کو اگلی زندگی میں جنتی دنیا کا شہری بنا سکیں۔ اسلامی تحریک کی کامیابی یہ ہے کہ خدا کی زمین پر ایسے بندے جنم لیں جو خدا میں جینے والے اور خدا میں سانس لینے والے ہوں۔ جو نفسیاتی پیچیدگیوں سے آزاد روح (Complex-free soul) کے مالک ہوں۔ یہ وہ انسان ہیں جو نئی پیدائش کا تجربہ کرتے ہیں۔ پہلی بار وہ اپنی ماؤں کے پیٹ سے نکلے تھے، اب وہ دوبارہ اسلام کی کوکھ سے جنم لیتے ہیں۔ یہ نئی پیدا شدہ روحیں وہ ہوتی ہیں کہ جب ان کے سامنے حق آتا ہے تو عزت کا سوال ان کے لئے قبول حق میں رکاوٹ نہیں بنتا۔ وہ "کھانا کھانے والے اور بازار میں چلنے والے" انسان کے ظاہری حلیہ سے گزر کر اس کے اندر چھپے ہوئے اس انسان کو دیکھ لیتے ہیں جو خدا سے رزق پاکر بولتا ہے اور خدا کی دنیا میں سیر کرکے لوگوں کو اس کے احوال سناتا ہے۔ وہ ایک معمولی انسان کے اندر چھپی ہوئی غیر معمولی عظمتوں سے باخبر ہو جاتے ہیں۔ وہ بے اختیار کہہ اٹھتے ہیں

کہ "خدایا ہم نے تیری آواز کو پہچان لیا۔ ہم اس پر ایمان لائے۔ ہم کو معاف فرما، ہم کو اپنی رحمتوں میں داخل کرلے"، خدا کی یاد سے ان کی روحیں اس طرح تروتازہ ہو جاتی ہیں جس طرح بارش پاکر درخت نکھر اٹھتا ہے۔ جو ایمان خدا کا خوف نہ پیدا کرے وہ جھوٹا ایمان ہے۔ جنگل میں شیر دھاڑتا ہے تو درخت کے بندر اس طرح زمین پر ٹپک پڑتے ہیں جیسے خزاں کے موسم میں درخت کی پتیاں جھڑتی ہیں۔ اگر انسان پر خدا کی ہیبت اتنی بھی طاری نہ ہو جتنی بندر کو شیر کے تصور سے ہوتی ہے تو اس نے خدا کو پایا کیا۔

اسلامی دعوت کی کوششوں کا مرکز اصلاً کوئی "اسٹیٹ" نہیں بلکہ وہ افراد ہیں جن کے لئے جنت یا جہنم کا فیصلہ ہونا ہے۔ خدا کی عدالت میں "اسٹیٹ" نہیں کھڑا کیا جائے گا بلکہ افراد کھڑے کئے جائیں گے اور ہر ایک کا الگ الگ حساب ہوگا۔ اسلام کے داعی کی سرگرمیوں کا اصل محرک یہ ہوتا ہے کہ وہ انسان کو اس خطرے سے بچائے۔ حقیقت یہ ہے کہ اسلامی دعوت کا نشانہ اصلاح نظام نہیں، اصلاح انسان ہے۔ اس اصول کی اہمیت صرف اس لئے نہیں ہے کہ افراد ہی کسی نظام کو بناتے یا بگاڑتے ہیں، افراد سے باہر کسی نظام کا وجود نہیں۔ اس سے بڑھ کر اس کی اہمیت یہ ہے کہ زندگی کا اصل مسئلہ جنت اور جہنم کا مسئلہ ہے اور یہ بات کہ کون جنتی ہے اور کون جہنمی، اس کا فیصلہ ہر فرد کے لئے الگ الگ کیا جائے گا نہ کہ مشترکہ طور پر۔ یہی وجہ ہے کہ اسلامی دعوت فرد کو اپنا نشانہ بناتی ہے۔ اس کی کوشش یہ ہوتی ہے کہ ایک ایک انسان کو اس قابل بنائے کہ مرنے کے بعد جب وہ خدا کے سامنے پہنچے تو اس کا خدا اس کو جہنم میں نہ ڈالے بلکہ اس کے لئے جنت کا فیصلہ کرے۔ اسلام ایک مستقل فکر اور ایجابی حقیقت ہے۔ وہ اس خدا کی طرف سے آیا ہے جو اپنی ذات میں ازلی و ابدی ہے۔ وہ انسان کی ناقابل تغیر فطرت کا مثنیٰ ہے۔ وہ ایک ایسا دین ہے جو کائنات میں مسلسل طور پر اول روز سے قائم ہے۔ انسان جب اس حیثیت سے اسلام کو پاتا ہے تو وہ فرشتوں کے قافلہ میں شامل ہو جاتا ہے۔ وہ خدا کی ابدی دنیا کا شہری بن جاتا ہے۔ وہ فانی کائنات سے گزر کر باقی رہنے والی کائنات میں داخل ہو جاتا ہے۔ جب کوئی شخص اس فوق الفطری تجربہ سے دوچار ہوتا ہے تو اس کے اندر ایک نیا انسان جنم لیتا ہے۔ اب وہ خدا کے رزق سے کھاتا ہے۔ وہ خدا کے دیدار سے آنکھیں ٹھنڈی کرتا ہے۔ وہ خدا کے پڑوس میں اپنی صبح و شام گزارنے لگتا ہے ——— اسی ربانی یافت کا نام ایمان ہے۔ موجودہ زندگی میں یہ یافت آدمی کو حسیاتی معنوں میں حاصل ہوتی ہے۔ موت کے بعد آنے والی دنیا میں وہ مادی اور حقیقی طور پر اس کو حاصل ہوگی جس کا دوسرا نام جنت ہے۔

اسلام کو سیاسی نعرہ کے طور پر استعمال کرنا

مگر اسلام جب سیاست بن جائے تو وہ آدمی کو اس حقیقی اسلام سے محروم کر دیتا ہے۔ اسلام کی دھوم کے درمیان وہی چیز غائب ہو جاتی ہے جو اسلام کا اصل مقصود تھی۔ اسلام اسی طرح دنیوی ہنگامہ آرائیوں کا عنوان بن جاتا ہے جس طرح مثال کے طور پر، سوشلزم اور کمیونزم بنے ہوئے ہیں۔ یہی نہیں، بلکہ اس قسم کی تحریک خود اسلامی نظام کے قیام کے امکانات کو بھی ختم کر دیتی ہے۔ کیوں کہ اسلامی نظام کو اسلامی افراد قائم کرتے ہیں اور اس قسم کی تحریکیں حقیقی اسلامی افراد کی پیدائش کا دروازہ ہی بند کر دیتی ہیں۔

"غریبی ہٹاؤ" کے نعرہ پر ایک تحریک اٹھتی ہے۔ مگر اس تحریک کے لوگ جس کے گرد جمع ہوتے ہیں وہ کوئی غریب نہیں ہوتا بلکہ ایک امیر لیڈر ہوتا ہے۔ کچھ لوگ مزدور کے مسائل کے نام پر اٹھتے ہیں۔ مگر وہ اپنی اجتماعیت کے لئے جس مرکزی ہستی کو پاتے ہیں وہ ایک ایسا لیڈر ہوتا ہے جو خود بہت بڑا لینڈ لارڈ ہے۔ ان واقعات کی وجہ یہ ہے کہ "غریب" کا وجود لوگوں کی نظر میں اتنا حقیر ہے کہ وہ انھیں دکھائی نہیں دیتا۔ وہ لوگوں کے لئے مرکز توجہ نہیں بنتا۔ لوگ کسی بڑی شخصیت ہی کے گرد جمع ہو سکتے ہیں جو ان کو قد آور دکھائی دیتی ہو اور یہ ان کو "لیڈر" ہی کی صورت میں ملتا ہے خواہ اس کا غریبی اور مزدوری سے کوئی تعلق نہ ہو۔

یہی صورت حال مذہب میں بھی پیش آتی ہے۔ مذہب کیا ہے، اپنے لئے ایک ملجا اور مرجع کو پالینا۔ جب مذہب کے نام پر وہ لوگ جمع ہوں جو مومنین بالغیب ہوں، وہ خدا کو نہ دیکھتے ہوئے بھی اس کو دیکھنے لگے ہوں، جو دنیا میں رہتے ہوئے بھی آخرت میں جینے لگے ہوں تو ایسے لوگوں کا ملجا اور مرجع خدا کی ذات بن جاتی ہے۔ ایسے لوگوں کے لئے سب سے بڑی حقیقت خدا ہوتی ہے۔ ان کے لئے یہ بات خارج از بحث ہوتی ہے کہ وہ خدا کے سوا کسی اور کے گرد جمع ہوں، وہ خدا کے سوا کسی اور کو اپنا مرکز و مرجع بنائیں۔

مگر جب مذہب کے گرد ایسے لوگ جمع ہو جائیں جو ایمان بالغیب کے مقام پر نہ ہوں۔ جن کو خدا سے زیادہ دوسری چیزیں نظر آتی ہوں، جو چھپی ہوئی دنیا سے زیادہ اس دنیا کو دیکھتے ہوں جو ان کی آنکھوں کے سامنے پھیلی ہوئی ہے، تو ان کا حال بھی وہی ہوتا ہے جو غریبوں اور مزدوروں کے نام پر اٹھنے والے لوگوں کا ہوتا ہے۔ وہ خدا کے نام پر اٹھتے ہیں مگر اپنی ظاہر پرستی کی وجہ سے کسی غیر خدا پر اٹک کر رہ جاتے ہیں۔ وہ اخروی نظام کا لفظ بولتے ہیں مگر عملاً وہ ایک دنیوی نظام پر ایمان لائے ہوتے ہیں۔ ان کا اسلام موت سے پہلے کی دنیا میں عزت حاصل کرنے کا ایک عنوان ہوتا ہے نہ کہ موت کے بعد کی دنیا میں عزت و کامیابی حاصل کرنے کا۔

اسلام فوجداری قانون کا نام نہیں

موجودہ زمانہ میں کچھ تحریکیں ابھری ہیں جو اسلام کے حدود و تعزیرات (سزاؤں) کے اجراء کو اسلامی نظام کے نفاذ کا نام دیتی ہیں، یہ بہت بڑی غلطی ہے۔ اسلام کے اس "فوجداری" تصور نے اسلام کے اصل مدعا کو ختم کر دیا ہے۔ کسی تعلیم گاہ میں بید کی سزاؤں کا اجراء تعلیم گاہ کے اندر ڈسپلن قائم کرنے سے تعلق رکھتا ہے نہ کہ اصل تعلیمی مقصد سے۔ اسی طرح اسلام میں جو سزائیں مقرر کی گئی ہیں، وہ مسلم معاشرہ کی تنظیم کے لئے ہیں۔ یہی اسلام کا اصل مقصد نہیں ہے۔ دور اول میں جب مدینہ میں اسلامی ریاست قائم ہوئی تو، مذکورہ معنوں میں، وہاں اسلامی نظام قائم ہو گیا۔ مگر اسی معاشرہ میں وہ "مسلمان" بھی تھے جن کے بارہ میں قرآن میں اعلان کیا گیا کہ اِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ فِي الدَّرْكِ الْاَسْفَلِ مِنَ النَّارِ (منافقین جہنم کے سب سے نچلے درجہ میں ہوں گے) حقیقت یہ ہے کہ اسلام کا اصل مقصد افراد کا تزکیہ ہے جو ان کے اندر وہ باطنی اوصاف پیدا کرے جو ان کو جنت کا مستحق بنانے والے ہوں۔ اسلام کی کوششوں کا نشانہ لوگوں کو جنتی انسان بنانا ہے نہ کہ ان کو کوڑے مارنا اور پھانسی دینا۔ ایک شخص جرم کرتا ہے۔ نظام اسلامی کے علم بردار اس کے لئے دعائیں نہیں کرتے،

تنہائیوں میں اس سے مل کر اس کو درد مندانہ نصیحت نہیں کرتے، اس کی اصلاح کے لئے وہ خیر خواہانہ کوشش نہیں کرتے جو ایک باپ اپنے بیٹے کے لئے کرتاہے۔ وہ صرف یہ کرتے ہیں کہ اس کو کوڑا مارنے اور پھانسی دینے کے لئے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ ایسے لوگ نظام اسلامی کے نام پر نظام فوجداری قائم کرنے کے علم بردار ہیں۔ نظام اسلامی قائم کرنے والے وہ ہیں جو اللہ کے بندوں کو اللہ کی جنت میں پہنچانے کی کوشش کر رہے ہوں۔ وہ حکمت اور خیر خواہی کے تمام تقاضوں کے تحت لوگوں کی اصلاح میں سرگرم ہوں۔ انتقامی جذبہ سے نہیں بلکہ اصلاح کے جذبہ سے ان کے اوپر حکم الہٰی کی تعمیل کریں خواہ وہ شخص کوئی غیر ہو یا خود اپنا بیٹا ہو۔

قوانین کا مقصد معاشرہ کی تنظیم

موجودہ زمانہ میں اسلام کے نام پر اٹھنے والی تحریکیں اکثر رد عمل کی تحریکیں تھیں نہ کہ حقیقۃً ایجابی اسلامی تحریکیں۔ پچھلی صدیوں میں مغربی قومیں نئی طاقتوں سے مسلح ہو کر اٹھیں اور انھوں نے پوری مسلم دنیا کو مغلوب کرلیا۔ وہ نہ صرف ان کی سیاست پر چھا گئیں بلکہ فکری اور ذہنی شعبوں پر بھی انھوں نے قبضہ کر لیا۔ مسلمانوں میں اس کا رد عمل ہونا فطری تھا۔ بہت سے لوگ اپنے ان نئے دشمنوں سے مقابلہ کرنے کے لئے اٹھ کھڑے ہوئے۔ یہ ایک دفاع کا کام تھا اور اگر دفاع کے عنوان کے تحت اس کو کیا جاتا تو اس میں کوئی ہرج نہ تھا۔ مگر جوش مقابلہ میں اسی کو دین کا اصل مدعا کہا جانے لگا۔ یہاں تک کہ کچھ لوگوں نے اسی کی بنیاد پر پورے دین کی تعبیر کر ڈالی۔ انھوں نے قرآن و حدیث کی تشریح اس انداز میں کی گویا قوموں سے لڑنا اور ان کے اوپر اپنی سیاست قائم کرنا ہی امت مسلمہ کا اصل مشن ہے۔ اس ٹکراؤ کا نشانہ ابتداءً غیر مسلم قومیں تھیں۔ مگر دوسری جنگ عظیم کے بعد جب مسلم ملکوں کو غیر مسلم قوموں کے سیاسی تسلط سے آزادی مل گئی تو ان کے حربی مشن کا نشانہ خود مسلم حکمراں قرار پائے۔ کیوں کہ وہ امت مسلمہ کے اصلی نصب العین (اسلامی قانون کا نفاذ) کو عمل میں نہیں لا رہے تھے۔ اس لئے ضروری تھا کہ ان سے لڑ کر ان کو ہٹایا جائے اور حکومتی اقتدار پر قابض ہو کر اسلامی قانون کو نافذ کیا جائے۔

اس نظریہ کا نتیجہ یہ ہوا کہ سیاست جو دین کا صرف ایک اضافی حصہ ہے، وہ دین کا اعتقادی حصہ بن گیا۔ اسلام کے اجتماعی قوانین حقیقۃً مسلم معاشرہ کی تنظیم کے لئے ہیں جو معاشرہ کی صلاحیت کے بقدر اس میں نافذ کئے جاتے ہیں۔ مگر اس تشریح دین نے اس کو جنت اور جہنم کا مسئلہ بنادیا۔ اسلامی قانون کو نافذ کرنے کے لئے سر دھڑ کی بازی لگاؤ تو جنت میں جاؤگے، ورنہ جہنم میں جلوگے۔ یہ وہی غلطی تھی جو پہلی صدی ہجری میں شیعہ حضرات نے کی۔ وہ خلافت کے عہدہ پر بنی ہاشم کے کسی فرد کو دیکھنا چاہتے تھے۔ اپنی اس سیاسی خواہش کو دینی جواز عطا کرنے کے لئے انھوں نے خاندانی خلافت کا عقیدہ وضع کیا اور اس طرح ایک سیاسی مسئلہ کو اعتقادی مسئلہ بنادیا۔ یہی غلطی دوسری بار موجودہ زمانہ کے مصلحین نے کی ہے۔ قانون اسلامی کا نفاذ کسی مسلم معاشرہ کی ایک تنظیمی ضرورت تھی جس طرح مسجد نمازیوں کے کسی گروہ کی عمارتی ضرورت ہوتی ہے۔ مگر اس کو انھوں نے مسلمانوں کی اعتقادی ضرورت بنادیا۔ اس کے نتیجہ میں جدید اسلامی تاریخ کی سب سے بڑی برائی وجود میں آئی۔ ہر مسلم ملک میں مسلمان دو جتھوں میں بٹ گئے۔ ایک حکمراں اور ان کے حامیوں کا، دوسرا اسلامی سیاست کے

علم بردار علما کا۔ یہ دونوں ایک کبھی نہ ختم ہونے والی جنگ میں معروف ہیں اور مسلمان کا جان و مال جو دوسرے مسلمان کے لئے حرام تھا، ہر ایک نے اپنے لئے جائز کر لیا ہے۔ وہ جنگ جو اپنے نفس سے لڑنی تھی یا خدا کے منکرین سے، وہ آپس میں بہت بڑے پیمانہ پر جاری ہے۔ مزید لطف یہ ہے کہ اس غیر اسلامی جنگ کو ہر ایک نے اسلامی جہاد کا نام دے رکھا ہے۔

فتنہ کی واپسی

اسلام کو سیاست بنانے کا سب سے بڑا نقصان یہ ہوا کہ وہ فتنہ (آزمائش) جس کو رسول اور اصحاب رسول نے بے پناہ قربانیوں کے بعد ختم کیا تھا، وہ اسلامی تاریخ میں دوبارہ لوٹ آیا۔ قدیم زمانہ میں سیاست اور شرک دونوں ایک دوسرے سے ملے ہوئے تھے۔ شاہی خاندان لوگوں میں یہ عقیدہ بٹھا کر حکومت کیا کرتا تھا کہ وہ دیوتا کی اولاد ہے، وہ خدا کی خدائی میں شریک ہے، وہ آسمانی دیوتاؤں کا دنیوی ظہور ہے۔ اسی بنا پر جب توحید خالص کی دعوت اٹھتی تو مشرکانہ عقائد کی بنیاد پر حکومت کرنے والے لوگ سمجھتے کہ یہ دعوت ان کے حق حکومت کو بے اعتبار بنا رہی ہے۔ وہ اس کو مٹانے کے لئے اپنی ساری طاقت اس کے خلاف لگا دیتے۔ اس طرح توحید کی دعوت اپنے آغاز ہی میں حکمرانوں کی حریف بن کر سخت مشکلات کا شکار ہو جاتی۔ چنانچہ قرآن میں حکم دیا گیا کہ وَقَاتِلُوهُمْ حَتَّىٰ لَا تَكُونَ فِتْنَةٌ وَيَكُونَ الدِّينُ لِلَّهِ (ان سے لڑو یہاں تک کہ فتنہ باقی نہ رہے اور دین صرف اللہ کے لئے ہو جائے) یعنی اہل شرک کی یہ حیثیت ختم ہو جائے کہ وہ خدا کے بندوں کے لئے آزمائش بنے ہوئے ہیں اور ان کو دین توحید اختیار کرنے سے روکتے ہیں۔ خدا کے عقیدہ کو بزور سیاسی ادارہ سے جدا کر دو تاکہ دین کا معاملہ تمام تر الٰہیاتی معاملہ بن جائے، وہ سیاسی معاملہ نہ رہے۔ اقتدار کے معاملہ سے اس کا اعتقادی تعلق ختم ہو جائے۔ دین کا تمام تر اللہ کے لئے ہو جانا یہ ہے کہ فتنہ (آزمائش) کی حالت ختم ہو جائے، دونوں کے درمیان کوئی اور چیز حائل نہ رہے۔

رسول اور اصحاب رسول کے ذریعہ جو تاریخ ساز انقلاب لایا گیا، اس نے شرک کو مقام اقتدار سے ہٹا دیا، اس نے مذہبی عقیدہ اور سیاسی ادارہ کے درمیان تعلق کو ہمیشہ کے لئے ختم کر دیا۔ اس طرح تاریخ میں پہلی بار یہ امکان پیدا ہوا کہ سیاسی ادارہ سے ٹکراؤ کا خطرہ مول لئے بغیر دعوت توحید کا کام کیا جا سکے۔ مگر مسلمانوں نے نئے عنوان سے دوبارہ وہی مشکلات دعوتی کام کی راہ میں پیدا کر دیں۔ پہلی صدی ہجری میں اہل بیت کی خلافت کو عقیدہ کا مسئلہ بنانا اس کی پہلی مثال تھی۔ اور موجودہ زمانہ میں "مکمل قانون کے نفاذ" کو علی الاطلاق امت مسلمہ کا فریضہ بتانا اس کی دوسری مثال ہے۔ اس تعبیر نے سیاسی جدوجہد کو عقیدہ کا مسئلہ بنا دیا۔ اب ہر ملک کے مسلمان "مکمل اسلامی قانون کے نفاذ" کے نام پر اپنے ملک کے حکمرانوں سے ٹکرا رہے ہیں اور سیاسی ادارہ دوبارہ نئے عنوان سے اسلام کا حریف بن گیا ہے جس طرح وہ ڈیڑھ ہزار سال پہلے اس کا حریف بنا ہوا تھا۔

احادیث سے ثابت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے بعد سب سے زیادہ جس چیز کا خطرہ محسوس کیا تھا وہ یہ کہ مسلمان آپس میں لڑیں گے۔ تاریخ سے اور موجودہ حالات سے اس کی پوری تصدیق ہوتی ہے۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ مسلمان آپس کی لڑائیوں میں جتنا زیادہ مشغول رہے ہیں اور مشغول ہیں اس کی مثال کسی بھی دوسری قوم میں نہیں ملتی۔ اخبار

سے لڑنے میں دوسری قومیں ہم سے آگے نظر آئیں گی۔ مگر خود اپنے ہم قوموں کے قتل و خون میں بہر حال مسلمان سب سے زیادہ آگے ہیں۔ اس کی سب سے بڑی وجہ یہی سیاست کو عقیدہ بنانا ہے۔ قدیم زمانہ میں جو باہمی لڑائیاں جاری رہیں، ان میں عام طور پر ان لوگوں کا ہاتھ کام کرتا ہوا نظر آتا ہے جنھوں نے یہ عقیدہ بنا لیا تھا کہ خلافت ایک مخصوص خاندان کا حق ہے۔ ان کے علاوہ شرعاً کسی کو مسلمانوں کے اوپر حکومت کرنا جائز نہیں۔ موجودہ زمانہ میں جمہوری اور سائنسی انقلابات نے اس ذہن کو فعال عقیدہ کی حیثیت سے ختم کر دیا تھا۔ مگر عین اس وقت قانون اسلامی کے نفاذ کو علی الاطلاق فرض بتانے والا نظریہ وجود میں آگیا اور اس نے اس باہمی لڑائی کو نئے عنوان سے مسلمانوں کے درمیان زندہ کر دیا۔

اسلامی نظام کیسے قائم ہوتا ہے

"سیاسی اسلام" کے نظریہ کا مزید نقصان یہ ہے کہ وہ مطلوبہ اسلامی سیاست قائم کرنے میں کبھی کامیاب نہیں ہو سکتا۔ یہ نظریہ گویا گاڑی کو گھوڑے کے آگے باندھنا ہے۔ درخت زرخیز زمین میں اگتا ہے نہ کہ پتھر کی چٹانوں پر۔ اسی طرح اسلامی نظام ہمیشہ حقیقی اسلامی معاشرہ میں قائم ہوتا ہے۔ جہاں اسلامی معاشرہ نہ پایا جائے، وہاں سیاسی تحریک چلا کر یا پھانسی اور گولی کی سزاؤں کے ذریعہ اسلام کا سیاسی درخت اگایا نہیں جا سکتا۔

جو شخص کسی عہدہ کا امیدوار ہو، اسلام کے مطابق، وہ اس عہدہ کے لئے سب سے زیادہ غیر موزوں شخص ہے۔ شریعت کی یہ تعلیم احادیث سے واضح طور پر ثابت ہے۔ یہاں چند روایتیں نقل کی جاتی ہیں:

ان اخونکم عندنا من طلبہ (ابو داؤد)	جو شخص طالب ہو، ہمارے نزدیک وہ سب سے زیادہ اس کا نااہل ہے
انا واللہ لا نولی علیٰ ھٰذا العمل احدا سألہ	خدا کی قسم حکومتی عہدہ پر ہم ایسے کسی شخص کا تقرر نہیں کرتے
ولا احدا حرص علیہ (بخاری و مسلم)	جو اس کو مانگے نہ ایسے کسی شخص کا جو اس کو چاہتا ہو۔
لا نستعمل علیٰ عملنا ھذا من ارادہ (بخاری و مسلم)	ہم اپنی حکومت کے کام پر ایسے شخص کو مقرر نہیں کرتے جو اس کی خواہش رکھتا ہو۔
تجدون خیر الناس اشد ھم کراھیۃ لھذا الامر حتی یقع فیہ (بخاری و مسلم)	تم سب سے بہتر اس شخص کو پاؤ گے جو حکومتی منصب کو سب سے زیادہ ناپسند کرتا ہو، یہاں تک کہ مجبوراً اس میں مبتلا ہو جائے۔

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ کون سا معاشرہ ہے جس کے اندر اسلامی نظام قائم ہوتا ہے۔ یہ وہ معاشرہ ہے جس کے افراد میں اقتدار پسندی نہ پائی جاتی ہو۔ جس کے سربرآوردہ لوگ خود شعوری کے اس مقام پر ہوں کہ وہ دوسرے کے مقابلہ میں اپنی نااہلی کو جانتے ہوں۔ جس کے افراد اتنے بلند نظر ہوں کہ عہدوں کے معاملہ میں اپنی ذات کی نفی کر کے سوچتے ہوں۔ ایسے لوگوں کے درمیان جب عہدیدار کے تقرر کا سوال آتا ہے تو سب میں جو موزوں ترین شخص ہوتا ہے وہ خود بخود ابھر کر سامنے آجاتا ہے۔ اور جب اس کا تقرر ہو جاتا ہے تو سارے لوگ فوراً اس کے تقرر کو مان لیتے ہیں۔ اس کے برعکس اگر معاشرہ کا یہ حال ہو کہ اس کے افراد اپنی اپنی اہلیتوں کو جاننے کے ماہر ہوں تو ایسے معاشرہ میں صرف باہمی لڑائیاں جنم لیتی ہیں،

اس سے اسلامی نظام برآمد نہیں ہوتا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں صحابہ کا جو گروہ جمع ہوا تھا، وہ وہی لوگ تھے جو اپنی نفی کرکے سوچتے تھے۔ چنانچہ آپ کے زمانہ میں کامیابی کے ساتھ نظام قائم ہوا اور چلتا رہا۔ خلیفہ اول اور خلیفہ دوم کے زمانہ میں اسی قسم کے لوگ معاشرہ پر چھائے ہوئے تھے۔ اس لئے ان کے زمانہ میں بھی اسلامی نظام کامیابی کے ساتھ قائم رہا۔ خلیفہ سوم اور چہارم کے زمانہ میں صورت حال بدل گئی۔ اب اسلامی معاشرہ میں ایسے لوگوں کی کثرت ہوگئی جو اپنی ذات کی نفی کرکے سوچنا نہیں جانتے تھے۔ چنانچہ عہدہ اور خلافت کے دعوے دار کھڑے ہونا شروع ہوگئے۔ اور باہمی لڑائیوں کا وہ سلسلہ شروع ہوا جس میں حقیقی اسلامی نظام منتشر ہو کر رہ گیا۔

جس معاشرہ کے لوگ اپنی ذات کی نفی کرکے سوچنا نہ جانتے ہوں وہاں اسلامی تحریک کا کام یہ ہے کہ ایسے افراد وجود میں لانے کی کوشش کرے جو فرائض کے معاملہ میں اپنے کو شامل کرکے سوچنے والے ہوں اور عہدوں کے معاملہ میں اپنے کو الگ کرکے سوچیں۔ اسلامی نظام قائم کرنے کا یہی واحد طریقہ ہے۔ اس کے برعکس مطالبہ اور ایجی ٹیشن کے ذریعہ اسلامی نظام نافذ کرنے کی کوشش ایک بے معنی کوشش ہے جو صرف ٹکراؤ کو جنم دیتی ہے۔ ایسے معاشرہ میں اس قسم کی تحریک عملاً مدعیان اقتدار کی تعداد میں اضافہ کے ہم معنی بن جاتی ہے۔ وہ فساد کو بڑھاتی ہے نہ یہ کہ معاشرہ میں اصلاح پیدا کرے۔

اقتدار کی طلب انسان کی سب سے بڑی طلب ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہر دور میں اقتدار کی جنگ جاری رہی ہے۔ سماج کے اندر ہمیشہ کثیر تعداد میں ایسے لوگ موجود رہتے ہیں جو کسی نہ کسی طرح اقتدار اور مرتبہ کے مقام پر پہنچنے کا خواب دیکھتے رہتے ہیں۔ تاریخ اس بات کی تصدیق کرتی ہے کہ انسانی معاشرہ ہمیشہ اقتدار اور بڑائی چاہنے والوں کا دنگل بنا رہا ہے۔ ایسی حالت میں کسی اصلاحی تحریک کا پہلا کام یہ ہے کہ وہ قلوب کی راہ سے لوگوں کے اندر داخل ہو کر ان کے جذبۂ اقتدار پسندی کو کم کرے۔ اس ابتدائی اصلاحی کام کو قابل لحاظ حد تک کئے بغیر جو لوگ "مطالبہ نظام اسلامی" کی مہم لے کر کود پڑیں وہ صرف فساد فی الارض میں اضافہ کریں گے۔ کیوں کہ اس قسم کی مطالباتی مہم طالبین اقتدار کی تعداد میں اضافہ کے ہم معنی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اقتدار کی رسہ کشی جو پہلے صرف عام دنیاداروں کے درمیان جاری تھی، اس میں مذہبی لوگوں کی بھیڑ کا بھی اضافہ ہو جائے۔ مزید اس شناعت کے ساتھ کہ اقتدار کی جو جنگ پہلے سیاست کے نام پر ہو رہی تھی وہ مذہب کے نام پر ہونے لگے۔ خدا کا دین جاہ طلبی کے بازار میں ایک سیاسی سودا بن کر رہ جائے۔

غیر جذباتی فیصلہ کرنے کی صلاحیت

اسلامی تحریک کو سیاسی تحریک بنانا پوری قوم کو جذباتی بنا کر رکھ دیتا ہے۔ جب کہ اسلام کو قائم کرنے کے لئے سب سے زیادہ جس چیز کی ضرورت ہے وہ ایسے انسانوں کی ایک جماعت ہے جو غیر جذباتی فیصلہ کرنے کی صلاحیت رکھتے ہوں، اس قسم کی تحریک، بالفرض ایک حکومت کو ختم کرنے میں کامیاب ہو جائے تب بھی وہ نئی صالح حکومت بنانے میں کامیاب نہیں

ہو سکتی۔ کیوں کہ عین اپنی فطرت کے نتیجہ میں، وہ ان افراد سے محروم ہوگی جو کسی نظام کو اسلامی طریق پر چلانے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔

ایک بار مجھے ایک کارخانہ میں جانے کا اتفاق ہوا۔ مجھے ایک مشین دکھائی گئی۔ کارخانہ کے مالک نے ایک بٹن دبایا۔ فوراً مشین کا بڑا پہیہ (Fly wheel) تیزی سے گھومنے لگا۔ پہیہ اپنی پوری رفتار سے ایک رخ پر گھوم رہا تھا کہ مالک نے دوسرا بٹن دبایا۔ اس کے بعد اچانک پہیہ نے رفتار بدلی اور تقریباً رکے بغیر دوسرے رخ پر اسی تیزی سے گھومنے لگا۔ یہ صلاحیت جو ایک مشین کو کامیاب بناتی ہے وہی اسلامی سیاست کی کامیابی کے لئے درکار ہے۔ اسلامی سیاست کو وہی لوگ کامیابی کے ساتھ چلا سکتے ہیں جو اپنے آپ پر اتنا زیادہ قابو رکھنے والے ہوں کہ نئی صورت حال پیش آنے کے بعد اچانک وہ اپنے رخ کو تبدیل کر سکیں۔

اسلامی نظام قائم کرنے کے لئے ایسے افراد درکار ہیں جو مذکورہ پہیے کی طرح بیک وقت اپنا رُخ تبدیل کر سکتے ہوں۔ جو جنگی جنون کی عین انتہا پر پہنچ کر صلح کا فیصلہ کر سکیں۔ جو غصہ اور انتقام کی بھڑکتی ہوئی آگ کے کے درمیان معاف کر دینے اور بھول جانے کا اعلان کر سکیں۔ جو لیڈری کے عالی شان مواقع کے ہوتے ہوئے اپنے آپ کو گم نامی کے گوشہ میں لے جانے پر راضی ہو جائیں۔ جو انتہائی اشتعال انگیز واقعات کے درمیان کھڑے ہو کر ایک انتہائی ٹھنڈا فیصلہ کر سکیں۔ جو فتح کے جلو میں ہوتے ہوئے غیر فاتحانہ رویہ کا مظاہرہ کر سکیں۔ یہ متضاد خصوصیات صرف انھیں لوگوں میں پیدا ہو سکتی ہیں جن کے خوف خدا نے ان کے "انا" کے خول کو چکنا چور کر دیا ہو۔ جن کے محاسبہ نفس نے ان کا یہ حال کر دیا ہو کہ وہ اپنے آپ کو اسی بے آمیز نظر سے دیکھنے لگیں جس نظر سے خدا انھیں دیکھ رہا ہے۔ جن کے ایمان نے ان کو اتنا باشعور بنا دیا ہو کہ ان کا شعور ان کے نفس کو کنٹرول کرنے لگے نہ کہ نفس ان کے شعور کا ———

انھیں اوصاف کے حاملین اسلامی نظام قائم کرتے ہیں۔ مگر اسلام کو سیاسی تحریک بنانے کے بعد جو سب سے بڑا نقصان ہوتا ہے وہ یہ کہ اس قسم کے افراد کی پیدائش کا امکان مکمل طور پر ختم ہو جاتا ہے۔ اسلام کے نام پر سیاسی تحریک چلانا گویا "آشیانہ" کے نام پر اس شاخ کو کاٹنا ہے جس پر بالآخر آشیانہ قائم ہونے والا ہے۔

دعوتی کام کی ہمہ گیری

مسلمان کا مشن دعوت الی اللہ ہے۔ یہی عمل اس کی دنیا و آخرت کی فلاح کا ضامن ہے۔ اسی عمل کو انجام دینے سے وہ اس کا مستحق قرار پاتا ہے کہ خدا کے یہاں امت محمدی کی حیثیت سے اٹھایا جائے۔ اور یہی وہ عمل ہے جو دنیا میں اس کی حفاظت و کامیابی کو یقینی بناتا ہے۔ اس کام کو چھوڑنے کے بعد مسلمان اللہ کی نظر میں اسی طرح بے حقیقت ہو جائیں گے جس طرح یہود اپنی داعیانہ حیثیت کو چھوڑنے کے بعد اللہ کی نظر میں بے حقیقت ہو گئے۔ اس سلسلے میں قرآن کی حسب ذیل آیت کا مطالعہ کیجئے:

يٰأَيُّهَا الرَّسُوْلُ بَلِّغْ مَا أُنْزِلَ إِلَيْكَ مِن ربك وان لم تفعل فما بلغت رسالته والله يعصمك من الناس ان الله لا يهدي القوم الكفرين (مائدہ ۶۷)

اے پیغمبر! تمھارے رب کی طرف سے جو کچھ تمھارے اوپر اتارا گیا ہے اس کو لوگوں تک پہنچا دو۔ اگر تم نے ایسا نہ کیا تو تم نے پیغمبری کا حق ادا نہ کیا۔ اور اللہ تم کو لوگوں کے شر سے بچائے گا۔ اللہ کبھی راہ نہیں دیتا منکر قوم کو۔

آیت کا خطاب اگرچہ بظاہر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ہے۔ مگر آپ کی تبعیت میں آپ کی امت بھی اس میں شامل ہے۔

اس آیت سے پہلی بات یہ معلوم ہوتی ہے کہ تبلیغ ما انزل اللہ (اللہ کے اتارے ہوئے علم کو لوگوں تک پہنچانا) وہ اصل کام ہے جو اللہ کو مسلمانوں سے مطلوب ہے۔ "اور اس طرح ہم نے تم کو بیچ کی امت بنا دیا تاکہ تم لوگوں پر بتانے والے (گواہ) بنو اور رسول ہو تم پر بتانے والا (بقرہ ۱۴۳) مسلمان کی اس حیثیت کو حدیث میں انتم شھداء اللہ فی الارض (تم زمین میں اللہ کے گواہ ہو) کے الفاظ میں واضح کیا گیا ہے۔ یہ ایک معلوم حقیقت ہے کہ کوئی شخص یا گروہ جس منصب پر متعین کیا جائے، اسی خاص منصب کی ادائگی یا عدم ادائگی پر اس کے مستقبل کا انحصار ہوتا ہے۔ اگر وہ اس متعین فریضہ کو ادا کرے تو اس کے لئے ہر قسم کے انعامات ہیں۔ اور اگر وہ اس فریضہ کو چھوڑ دے تو دوسرا کوئی کام، خواہ وہ کتنے ہی بڑے پیمانہ پر کیا جائے، اس کو اپنے آقا کی نظر میں کسی رتبہ کا مستحق نہیں بناتا۔ اس معاملہ میں مسلمانوں کو اس تنبیہ سے ڈرنا چاہئے جو ان کے پیشرو حاملین کتاب (یہود) کو اس وقت دی گئی جب کہ وہ "اللہ کی طرف سے بتانے" کا کام چھوڑ بیٹھے اور اللہ کی طرف منسوب کر کے (اعراف ۲۸) دوسرے دوسرے کام کرنے لگے:

وَاِذْ اَخَذَ اللّٰہُ مِیْثَاقَ الَّذِیْنَ اُوْتُوا الْکِتٰبَ لَتُبَیِّنُنَّہٗ لِلنَّاسِ وَلَا تَکْتُمُوْنَہٗ فَنَبَذُوْہُ وَرَآءَ ظُھُوْرِھِمْ وَاشْتَرَوْا بِہٖ ثَمَنًا قَلِیْلًا فَبِئْسَ مَا یَشْتَرُوْنَ ۝ لَا تَحْسَبَنَّ الَّذِیْنَ یَفْرَحُوْنَ بِمَآ اَتَوْا وَّیُحِبُّوْنَ اَنْ یُّحْمَدُوْا بِمَا لَمْ یَفْعَلُوْا فَلَا تَحْسَبَنَّھُمْ بِمَفَازَۃٍ مِّنَ الْعَذَابِ وَلَھُمْ عَذَابٌ اَلِیْمٌ (آل عمران ۱۸۸-۱۸۷)

اور جب اللہ نے اقرار لیا اہل کتاب سے کہ تم اس کو لوگوں کے سامنے بیان کرو گے اور اس کو نہیں چھپاؤ گے، پھر انھوں نے اس اقرار کو پیٹھ کے پیچھے پھینک دیا اور اس کے بدلے میں مول لے لیا تھوڑا۔ پس کیسی بری چیز ہے جس کو وہ لے رہے ہیں۔ جو لوگ اپنے اس کردار پر خوش ہوتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ جو کام نہیں کیا اس پر ان کی تعریف ہو، ایسے لوگوں کو عذاب

سے بچائے میں نہ سمجھو اور ان کو دردناک سزا ہوگی۔

کوئی گروہ جو آسمانی کتاب کا حامل ہو، وہ اللہ کی نظر میں اس وقت بے حقیقت ہو جاتا ہے جب کہ وہ اللہ کے حکم کے مطابق اللہ کی اتاری ہوئی ہدایت کو اللہ کے بندوں تک نہ پہنچا رہا ہو۔ دعوت الی اللہ کے کام کو چھوڑ کر دوسرے کام کرنا اور اس کو مطلوب دینی کام کا عنوان دینا صرف آدمی کے جرم میں اضافہ کرتا ہے۔ وہ اس کو دینی کریڈٹ کا مستحق نہیں بناتا۔

مسائل کا حل دعوت الی اللہ

دعوت کا حکم دیتے ہوئے یہ کہنا کہ "اللہ تم کو لوگوں سے بچائے گا" واضح کرتا ہے کہ دعوتی عمل ہی میں مسلمانوں کے تمام مسائل کے حل کا راز بھی چھپا ہوا ہے۔ دنیا میں مسلمان جن لوگوں کے درمیان ہیں، ان کی طرف سے بے شمار متوقع اور غیر متوقع مشکلیں پیش آتی ہیں۔ مگر مسلمانوں کو ان سب پر الگ الگ طاقت خرچ کرنے کی ضرورت نہیں۔ ان کے لئے ان کے رب نے ایک ایسا سرا دے دیا ہے جو تمام چیزوں کا جامع ہے۔ اور وہ سرا دعوت الی اللہ ہے۔ ایک شخص اپنی زندگی میں بے شمار ضرورتوں کا محتاج ہوتا ہے۔ مگر وہ ہر ضرورت پر الگ الگ دھیان نہیں دیتا بلکہ اپنی ساری طاقت اس چیز کو حاصل کرنے میں لگا دیتا ہے جس کو "پیسہ" کہتے ہیں۔ کیوں کہ وہ جانتا ہے کہ پیسہ قاضی الحاجات اور حل المشکلات ہے۔ پیسہ بظاہر ایک چیز ہے مگر وہ ہاتھ آجائے تو بقیہ ضرورتیں خود بخود پوری ہوتی چلی جاتی ہیں۔ ایسا ہی کچھ معاملہ دعوت الی اللہ کے کام کا ہے۔ وہ تمام مسائل جو دنیا کی زندگی میں مسلمانوں کو پیش آئیں، ان سب کا مشترک حل دعوت ہے۔ دعوت الی اللہ میں "عصمت من الناس" کا راز چھپا ہوا ہے۔ "اللہ منکروں کو راہ نہیں دیتا" کا مطلب یہ ہے کہ دعوتی کام کے بعد یہ ہوگا کہ تمہارے معاندین تمہارے خلاف اپنے عزائم کی تکمیل کے مواقع نہ پا سکیں گے، تمہارے دعوتی عمل کے نتیجہ میں ان کی راہیں مسدود ہوتی چلی جائیں گی۔ دعوت الی اللہ کا یہی تسخیری پہلو ہے جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد میں ملتا ہے جو آپ نے مکہ کے منکرین کے سامنے پیش کیا تھا:

کلمة واحدة تعطونیها تملکون بها العرب وتدین لکم بها العجم (البدایہ والنہایہ جلد ۲ صفحہ ۱۲۳)

تم مجھے ایک کلمہ دے دو، اس سے تم تمام عرب کے مالک ہو جاؤ گے اور عجم تمہارا مطیع فرمان ہوگا۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی اس قرآنی تعلیم کا مکمل نمونہ ہے۔ آپ نے مختلف پیش آمدہ مسائل کو براہ راست نشانہ بنانے کے بجائے اپنی ساری توجہ دعوت کے کام پر لگا دی۔ اسی سے اللہ نے دوسرے تمام مسائل کے حل کی راہیں نکال دیں۔ مثال کے طور پر معاہدہ حدیبیہ (۶ھ) کے وقت منکرین نے آپ کو مسائل و مشکلات کے جنگل میں گھیر لیا تھا۔ حتی کہ بیت اللہ الحرام کی زیارت کا حق دینے پر بھی وہ راضی نہ تھے۔ اس وقت آپ نے کیا کہ منکرین کی خود ساختہ شرائط کو مانتے ہوئے ان سے دس سال کا ناجنگ معاہدہ کر لیا۔ یہ منکروں کو ان کی منہ مانگی قیمت دے کر اپنے لئے دعوتی کام کی راہ کھولنا تھا۔ مسئلہ جنگ کی سطح پر تھا مگر آپ نے اس کا حل دعوت کی سطح پر تلاش کیا۔ چنانچہ اس معاہدہ کے بعد جیسے ہی امن ہوا، آپ نے ایک طرف رؤسا و ملوک کو دعوتی وفود بھیجنے شروع کئے اور دوسری طرف عرب کے قبائل

میں دعوت کا کام پوری طاقت کے ساتھ جاری کر دیا۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ مسلمانوں کی تعداد بہت تیزی سے بڑھنے لگی۔ حدیبیہ کے میدان سے آپ تقریباً ڈیڑھ ہزار مسلمانوں کے ساتھ واپس ہوئے تھے۔ دو سال بعد (۸ ھ) آپ نے دس ہزار مسلمانوں کے ساتھ مکہ کو خون بہائے بغیر فتح کر لیا۔ یہی طریق کار تھا جس نے ساتویں صدی ہجری میں تاتاریوں کے خلاف مسلمانوں کی مدد کی۔ تاتاری فوجوں کی یلغار اتنی زبردست تھی کہ اس زمانہ میں کہا جانے لگا تھا کہ اذا قیل لک ان التتر انھزموا فلا تصدق (اگر تم سے کہا جائے کہ تاتاری ہار گئے تو اس کو مت ماننا) مگر وہ فتنہ جس کے حل سے مسلمانوں کی تلوار عاجز ہو رہی تھی۔ اس کو دعوت نے حل کر دیا۔ مسلمانوں کی دعوتی جد وجہد سے تاتاری بڑی تعداد میں مسلمان ہو گئے۔ وہ لوگ جو مسلمانوں کو تباہ کرنے کے لئے نکلے تھے وہ خود مسلمانوں میں شامل ہو کر ملتِ اسلامی کا جزء بن گئے۔

بعد کے دور میں مسلمانوں کو جو مسائل پیش آئے، اس کی واحد سب سے بڑی وجہ یہ تھی کہ ان کے اندر دعوتی ذہن ختم ہو گیا۔ وہ "دینی جد وجہد" کے نام پر دوسرے دوسرے کام کرنے لگے۔ ظاہر ہے کہ خدا کی اس دنیا میں اس قسم کے خود ساختہ طریقوں کا کوئی نتیجہ نہیں نکل سکتا۔ آپ اگر گیہوں کے دانہ کے شکل کے پتھر تراشیں اور ان کو زمین میں بوئیں تو ان پتھروں کے ٹکڑوں سے گیہوں کا پودا نہیں اُگ سکتا، خواہ آپ نے اس کی تراش میں کتنی ہی کاریگری دکھائی ہو۔ گیہوں کی فصل گیہوں کے دانوں سے اگتی ہے نہ کہ پتھر کے ہم شکل ٹکڑوں سے۔ اس بات کو یہاں ہم چند مثالوں سے واضح کریں گے۔

دعوتی غفلت کے نتائج

ا۔ موجودہ زمانہ میں مسلم قوموں کے لئے جو مسائل پیدا ہوئے ان میں سب سے بڑا مسئلہ "استعمار" کا سمجھا جاتا ہے۔ اس نے نہ صرف مسلم قوموں کو سیاسی طور مغلوب کیا بلکہ بے شمار دوسرے مصائب میں مبتلا کر دیا۔ انگریزوں کے درمیان اگر تبلیغی کام کیا جاتا تو عین ممکن تھا کہ انگلستان زیادہ بہتر طور پر دوسرا ترکی ثابت ہوتا۔ انگریزوں کے اندر قبولیت اسلام کا مادہ ہونے کا یہ ثبوت کافی ہے کہ عین اقتدار کے زمانہ میں ان کے افراد مسلمان ہوتے رہے۔ مگر پچھلے کئی سو برس کے اندر کبھی مسلمانوں میں یہ ذہن پیدا نہیں ہوا کہ وہ انگریزوں کے اوپر خدا کے دین کی تبلیغ کریں۔ حتیٰ کہ اگر کسی نے اس قسم کی تجویز پیش کی تو کہا گیا کہ یہ انگریزوں کا ایجنٹ ہے اور چاہتا ہے کہ مسلمانوں کو جہادِ آزادی کے محاذ سے ہٹا دے۔ تاہم موجودہ زمانہ میں اس سلسلے میں جو غفلتیں کی گئی ہیں، ان کا میں یہاں ذکر نہیں کروں گا۔ میں انگلستان کی ایک تازہ مطبوعہ کتاب "تاتار خاں کا انگریز" نامی کتاب کے مصنف گیبریل رونے کے ایک مضمون کا حوالہ دوں گا۔ یہ مضمون لندن کے اخبار سنڈے ٹائمز (۲۲ اکتوبر ۱۹۷۸) میں شائع ہوا ہے۔ انگریز مصنف نے بعض تاریخی دستاویزات کا حوالہ دیتے ہوئے لکھا ہے:

"For a crucial moment in the thirteenth century England faced the prospect of being totally converted-lock, stock and barrel-into a Muslim country."

تیرھویں صدی عیسوی میں ایک نازک لمحہ میں انگلستان کے لئے یہ امکان پیدا ہو گیا تھا کہ وہ مکمل طور پر ایک مسلم ملک میں تبدیل ہو جائے۔ اس کا خلاصہ یہ ہے کہ انگلستان کا بادشاہ جان لاک لینڈ (۱۲۱۶-۱۱۶۷ء) کلیسا کے رویہ کی وجہ

*Gabriel Ronay, *The Tartar Khan's Englishman*, Cassel, London, 1978.

سے عیسائیت سے بیزار ہو گیا۔ اس نے طے کر لیا کہ وہ اپنی رعایا سمیت مسلمان ہو جائے اور مسلم خلیفہ کی اطاعت قبول کرے۔ اس نے ۱۲۱۳ء میں سلطنت موحدین کے امیر ناصر لدین اللہ کے پاس ایک خفیہ وفد بھیجا جو تین افراد پر مشتمل تھا۔ یہ لوگ سفر کر کے مراکش پہنچے اور امیر ناصر لدین اللہ سے ملے۔ انھوں نے امیر کو شاہ جان کا خط پیش کیا اور ترجمان کے ذریعہ اپنے بادشاہ کی خواہش سے اس کو آگاہ کیا کہ وہ امیر کے ہاتھ پر اسلام قبول کرنا چاہتا ہے۔ مگر ناصر لدین اللہ دعوت و تبلیغ کا مزاج نہ رکھتا تھا۔ وہ اس پیش کش میں دل چسپی نہ لے سکا اور وفد ناکام اپنے وطن واپس لوٹ گیا۔ شاہ انگلستان کو جب یہ معلوم ہوا تو وہ سخت غمگین ہوا اور بہت رویا۔ شاہ انگلستان کو اس وقت اگر اسلام میں داخل کر لیا جاتا تو اس میں کوئی شک نہیں کہ پورا انگلستان مسلمان ہو جاتا اور اس کے بعد استعمار کی تاریخ اور یورپ کی نشاۃ ثانیہ کی تاریخ بالکل دوسری ہوتی۔ وہ لوگ جو حالیہ صدیوں میں اسلام کا جھنڈا گرانے کے درپے ہوئے، وہ اسلام کا جھنڈا بلند کرنے والے بن جاتے۔ حتی کہ اسرائیل کا مسئلہ سرے سے وجود میں نہ آتا جس نے آج سارے عالم اسلام کو اپنی لپیٹ میں لے رکھا ہے۔

۲- اسرائیل کو اگرچہ انگریزوں نے پیدا کیا۔ مگر آج اس کا سب سے بڑا سہارا امریکہ ہے۔ اس مسئلہ نے مسلم دنیا کو بہت بڑے پیمانہ پر متاثر کیا ہے اور پوری مسلم دنیا اس کے خلاف متحد ہے۔ تاہم ۴۰ سال کی طویل جد و جہد کے باوجود ابھی تک مسلمانوں کو اس محاذ پر کوئی کامیابی نہیں ہوئی۔ جہاں تک یہودیوں کے قبول اسلام کا تعلق ہے ہمیں اس معاملہ میں کوئی خوش گمانی نہیں۔ اگرچہ اتمام حجت کے لئے ہم کو یہود تک بھی اسلام کی دعوت پہنچانا چاہئے۔ مگر مخصوص وجوہ سے عملاً اس کی بہت کم امید کی جا سکتی ہے کہ یہود کی کوئی قابل لحاظ تعداد اسلام قبول کرے۔ تاہم جہاں تک تبلیغی طریق کار کا تعلق ہے، یہاں بھی اس کی افادیت مسلّم ہے۔ تبلیغی طریق کار کے براہ راست طور پر یہود پر موثر ہونے کی اگرچہ زیادہ امید نہیں کی جا سکتی۔ تاہم بالواسطہ طور پر ان پر اثر انداز ہونے کے پورے امکانات تھے۔ مگر دعوتی ذوق نہ ہونے کی وجہ سے مسلمان اس کو استعمال نہ کر سکے۔

بالواسطہ طریق کار سے مراد امریکہ پر تبلیغ ہے۔ یہ ایک معلوم بات ہے کہ اسرائیل کا اصل سرپرست امریکہ ہے۔ امریکہ ہی وہ طاقت ہے جو اسرائیل کو زندہ رکھے ہوئے ہے۔ امریکہ، سائنٹفک معاشرہ ہونے کے بنا پر، آج اسلام کی تبلیغ کا سب سے کامیاب میدان بن سکتا ہے۔ مگر مسلمانوں کا تبلیغی کام امریکہ میں صفر کے درجہ میں ہے۔ جب کہ ہندوازم اور بدھ ازم تک نے وہاں اپنے لئے کام کے نہایت قیمتی مواقع پائے ہیں۔ یہاں ہم یاد دلائیں گے کہ ۱۸۸۴ میں جب کہ سید جمال الدین افغانی اور ان کے شاگرد مفتی محمد عبدہ پیرس میں تھے۔ سید جمال الدین افغانی نے اپنے شاگرد سے کہا:

ان اهل اوربا مستعدون لقبول الاسلام اذا احسنت الدعوة اليه۔ فقد قارنوا بين الدين الاسلامي وبين غيره فوجدوا البون شاسعا من حيث يسر العقائد وقرب تناولها۔ واقرب من اهل اوربا الى قبول الاسلام اهل امريكا لانه لا يوجد بينهم وبين الامم الاسلامية

یورپ کے لوگ اسلام قبول کرنے کے لئے تیار ہیں۔ اگر اس کی دعوت اچھی طرح ان کے سامنے پیش کی جائے۔ کیوں کہ انھوں نے اسلام اور دوسرے مذہبوں کا تقابلی مطالعہ کیا تو انھوں نے پایا کہ عقیدہ کی سادگی اور عمل کی آسانی کے اعتبار سے دونوں میں بہت فرق ہے۔ اور مغربی اقوام میں

عداوات موروثة ولا اضغان مدفونة مثلما هو الحال بين المسلمين والاوربيين
جمال الدين الافغانی، تالیف محمود ابوریہ، ۵۰

قبول اسلام کے اعتبار سے سب سے زیادہ قریب امریکہ کے لوگ ہیں۔ کیونکہ ان کے اور اسلامی قوموں کے درمیان اس طرح کی قدیم عداوتیں نہیں ہیں جو مسلمان اور یورپی قوموں میں ہیں۔

اپنے استاد کی زبان سے یہ بات سن کر مفتی محمد عبدہ نے ان سے کہا: پھر کیوں نہ ہم ایسا کریں کہ سیاسی مقابلہ آرائی کو چھوڑ کر امریکہ میں تبلیغ و دعوت کا کام کریں۔ جمال الدین افغانی کے سیاسی ذوق کو تبلیغی کام ایک ہلکا کام معلوم ہوا، انھوں نے کہا: انما انت مثبط (تم تو حوصلہ پست کرنے والی باتیں کرتے ہو) سید جمال الدین افغانی انتہائی غیر معمولی صلاحیت کے آدمی تھے۔ وہ اگر اپنی پوری طاقت تبلیغ و دعوت کے کام میں لگا دیتے تو وہ امریکہ میں زبردست دعوتی کام پھیلا سکتے تھے۔ اور اگر انھوں نے سو سال پہلے یہ کام شروع کر دیا ہوتا تو عجب نہیں کہ آج امریکہ ایک مسلم ملک بن چکا ہوتا۔ اور یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ امریکہ میں اسلام پھیل جانے کے بعد اسرائیل کی تاریخ اس سے بالکل مختلف ہوتی جو آج ہمیں نظر آتی ہے۔ دوسرے لفظوں میں، وہ تاریخ دوبارہ نئی صورت میں دہرائی جاتی جب کہ قبیلہ ہوازن (۶ ہزار) کے مسلمان ہو جانے کے بعد قبیلہ ثقیف (طائف) نے ہتھیار ڈال دئے تھے۔ ظہور اسلام، صفحہ ۳۹)

۳۔ موجودہ زمانہ میں مسلمانوں کا ایک بہت بڑا مسئلہ ان کی سائنسی اور صنعتی پس ماندگی ہے۔ اسی پس ماندگی کا یہ نتیجہ ہے کہ بے پناہ قربانیوں کے باوجود انھوں نے مغربی استعمار سے جو سیاسی آزادی حاصل کی تھی وہ صنعتی محکومی کی صورت میں دوبارہ ان کی طرف لوٹ آئی۔ حتیٰ کہ تیل پیدا کرنے والے مسلم ممالک اپنے تیل سے جو دولت حاصل کرتے ہیں وہ دوبارہ مختلف بہانوں سے انھیں مغربی ملکوں میں واپس چلی جاتی ہے جو صنعت اور سائنس میں اپنی برتری کی وجہ سے مسلم ملکوں کی تمام سرگرمیوں پر اپنا سایہ ڈالے ہوئے ہیں۔

بظاہر اس مسئلہ کا تبلیغ و دعوت کے کام سے کوئی تعلق نظر نہیں آتا۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ دونوں میں نہایت گہرا تعلق ہے۔ صنعت اور سائنس کو وجود میں لانے والے بالآخر انسان ہوتے ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ انسان اگر ہاتھ آجائیں تو صنعت اور سائنس خود بخود ہاتھ آجائے گی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خود لکھنا نہیں جانتے تھے (عنکبوت ۴۸) مگر آپ کی دعوت کے ذریعہ ایسے لوگ اسلام میں داخل ہوئے جو لکھنا جانتے تھے۔ انھوں نے اپنے ہاتھ سے آپ کی وحی کو کتابی صورت میں لکھا۔ موجودہ زمانہ میں اس سلسلے میں جاپان کی مثال دی جا سکتی ہے۔ جاپان صنعت اور سائنس کے اعتبار سے آج صف اول کی قوموں میں شمار ہوتا ہے۔ عجیب بات ہے کہ انیسویں صدی کے آخر میں جاپان میں اسلام کی اشاعت کے غیر معمولی امکانات پیدا ہو گئے تھے۔ جاپان کا بادشاہ میجی (۱۹۱۲ – ۱۸۶۸) جاپان میں مسیحیت کے داخلہ سے سخت متوحش تھا۔ کیوں کہ اس کے نزدیک مسیحیت، مذہبی لباس میں، مغرب کی استعماری طاقتوں کا ہراول دستہ تھا۔ اس نے مسیحیت کو روکنے کے لئے یہ تدبیر سوچی کہ جاپان میں اسلام کو پھیلایا جائے۔ وہ اسلام کو ایک بے ضرر چیز سمجھتا تھا۔ جب کہ مسیحیت کے داخلہ کا مطلب اس کے نزدیک استعمار کا دروازہ کھولنے کے ہم معنی تھا۔ شاہ میجی نے ۱۸۹۱ میں ترکی کے سلطان عبدالحمید ثانی

(۱۹۱۸ - ۱۸۴۲) کے پاس ایک سرکاری وفد بھیجا۔ اس وفد کے پاس شاہ جاپان کا ایک خط تھا جس میں درخواست کی گئی تھی کہ سلطان "اپنے مبلغین کو جاپان بھیجے جو جاپانیوں کو مذہب اسلام کی تعلیمات سے واقف کرائیں اور اس طرح جاپان اور عالم اسلام کے درمیان معنوی رشتہ قائم ہو" مگر نہ سلطان میں دعوت و تبلیغ کا جذبہ تھا اور نہ ان علماء میں جو اس کے گرد و پیش جمع تھے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ یہ پیش کش شکریہ کے ساتھ واپس کردی گئی اور اس سمت میں کوئی کام شروع نہ ہوسکا۔ اگر موقع سے فائدہ اٹھایا جاتا اور ۱۸۹۱ سے جاپان میں تبلیغ اسلام کا کام شروع ہوجاتا تو پورے اعتماد کے ساتھ کہا جاسکتا ہے کہ آج جاپان ایک مسلم ملک ہوتا اور اس کا مسلم ملک ہونا مسلمانوں کی سائنسی اور صنعتی پس ماندگی کی مکمل تلافی کردیتا۔

۳۔ اب اس مسئلہ کو لیجئے جس کو "ہندستانی مسلمانوں کا مسئلہ" کہا جاتا ہے۔ یہ مسئلہ بھی تمام تر دعوت و تبلیغ کے کام سے غفلت کی پیداوار ہے۔ ہندستان میں اسلام کی طویل تاریخ میں کبھی تبلیغ کی سنجیدہ کوشش نہیں کی گئی۔ یہاں جو لوگ اسلام کے حلقہ میں داخل ہوئے وہ زیادہ تر خود اپنے جذبہ سے داخل ہوئے نہ کہ حقیقۃً مسلمانوں کی کسی دعوتی کوشش سے۔ صوفیاء کے ہاتھ پر ماضی میں کثرت سے لوگوں نے اسلام قبول کیا ہے۔ مگر یہ کہنا مشکل ہے کہ تبدیلی مذہب کے یہ واقعات ارادی طور پر کسی قابل ذکر تبلیغی کوشش کا نتیجہ تھے۔ یہ زیادہ تر قدیم حالات کی بنا پر تھا جب کہ مذہبی تعصب نہیں تھا اور لوگ معمولی اسباب سے اپنا مذہب بدلنے کے لئے تیار ہوجاتے تھے۔ جواہر لال نہرو نے لکھا ہے: "اسلام کی آمد ہندستان کی تاریخ میں کافی اہمیت رکھتی ہے۔ اس نے ان خرابیوں کو جو ہندو سماج میں پیدا ہوگئی تھیں، یعنی ذاتوں کی تفریق، چھوت چھات اور انتہا درجہ کی خلوت پسندی کو بالکل آشکارا کردیا۔ اسلام کے اخوت کے نظریے اور مسلمانوں کی عملی مساوات نے ہندوؤں کے ذہن پر بہت گہرا اثر ڈالا۔ خصوصاً وہ لوگ جو ہندو سماج میں برابری کے حق سے محروم تھے، اس سے بہت متاثر ہوئے۔ اس نئے تاثر نے ملک میں بہت سی تحریکیں پیدا کیں۔ چنانچہ بہت سے لوگ اپنا مذہب چھوڑ کر نئے مذہب میں شامل ہوگئے۔ ان شامل ہونے والوں میں اکثریت نیچ ذات کی تھی۔ ان میں کچھ ایسے بھی تھے جنھوں نے سیاسی اور اقتصادی مصلحتوں کی بنا پر مذہب تبدیل کیا تھا۔ حکمراں طاقت کا مذہب قبول کرنے میں جو فائدہ تھا وہ ظاہر ہے۔ یہاں ایک چیز خاص طور پر قابل لحاظ ہے۔ عام طور پر پوری پوری جماعتیں ہندو سے مسلمان ہوجاتی تھیں۔ اس سے ہمیں اس اثر کا پتہ چلتا ہے جو ان دونوں جماعت کو حاصل تھا۔ اعلیٰ ذاتوں میں سے تو فرداً فرداً بھی لوگ تبدیل مذہب کرتے تھے۔ مگر نیچی ذاتوں میں ایک مقام کی کوئی پوری برادری یا سارے کا سارا گاؤں اسلام قبول کرلیتا تھا" جواہر لال نہرو مزید لکھتے ہیں "اس زمانہ میں لوگوں نے خواہ انفرادی طور پر اسلام قبول کیا یا جماعتی طور پر، ہندو قوم نے اس کی مخالفت نہیں کی۔ انھیں اس کی پروانہ تھی کہ ان کے کچھ لوگ کسی دوسرے مذہب کے پیرو بن جائیں۔ پرانے زمانہ میں تو یہ حال تھا۔ مگر آج کل معاملہ اس کے برعکس ہے۔ اب اگر کوئی شخص اسلام یا مسیحیت قبول کرتا ہے تو ہر طرف غم و غصہ کے جذبات مشتعل ہوجاتے ہیں۔ آج کل کا یہ شور و غوغا سیاسی اسباب کے تحت ہے۔ کوئی دوسری جماعت کا مذہب اختیار کرلیتا ہے تو سمجھا جاتا ہے کہ اس سے اس جماعت کو تقویت پہنچی۔ سیاسی اختیارات میں اس کی نیابت کے حقوق بڑھے" (ڈسکوری آف انڈیا، ۱۹۴۵، صفحات ۸۱ - ۲۷۹)

ماضی کی تاریخ میں کثرت سے ایسے واقعات موجود ہیں جو یہ ثابت کرتے ہیں کہ اس ملک میں اگر سنجیدگی کے ساتھ

اسلام کی تبلیغ کی گئی ہوتی تو یہاں اس کی اشاعت کے غیر معمولی امکانات تھے۔ مثلاً ۱۸۵۷ کے نام نہاد جہاد آزادی کے بعد جب مسلمانوں کی پکڑ دھکڑ شروع ہوئی تو بہت سے علماء روپوش ہو گئے۔ ان میں سے ایک بڑی تعداد ہمالیہ کے جنگلوں میں پھیل گئی اور "دعا تعویذ" کے انداز پر کام کرنے لگی۔ ان کے اثر سے اس علاقہ کے لوگ کثرت سے مسلمان ہو گئے۔ چنانچہ آسام سے لے کر کشمیر تک پہاڑوں میں جو چھوٹی چھوٹی بستیاں پھیلی ہوئی ہیں، ان میں مسلمان بڑی تعداد میں آباد ہیں اور یہ اسی وقت کی یادگار ہیں۔ اسی طرح علماء کی ایک تعداد مشرقی بنگال کے پس ماندہ علاقہ میں داخل ہو گئی جہاں اس زمانہ میں سڑکیں وغیرہ کم ہونے کی وجہ سے انگریزی دار وگیر کا خطرہ نہیں تھا۔ یہ لوگ خاموشی کے ساتھ وہاں خانقاہیں بنا کر رہنے لگے۔ ان کے اثر سے اس علاقہ کی اکثریت مسلمان ہو گئی۔ یہی کام اگر حقیقی شعور اور منصوبہ بندی کے تحت کیا جاتا تو آج ملک کی تاریخ دوسری ہوتی اور اسی کے ساتھ مسلمانوں کی بھی۔

موجودہ زمانے میں مسلمانوں نے بے شمار تحریکیں اٹھائیں۔ حتیٰ کہ ان کی تحریکوں کے غلغلہ سے فضائے آسمانی گونج اٹھی۔ مگر وہی ایک کام انھوں نے نہ کیا جو ان کے خدا نے سب سے زیادہ ان پر فرض کیا تھا یعنی اللہ کے دین کو اس کے تمام بندوں تک پہنچانا۔ تاہم مسلمانوں کی کسی کوشش کے بغیر دین فطرت لوگوں کے دلوں میں اپنی جگہ بنا رہا ہے کوئی دن ایسا نہیں گزرتا جب کہ دنیا میں کہیں نہ کہیں یہ واقعہ پیش نہ آتا ہو کہ اللہ کے بندے اللہ کے دین کو قبول کر کے اس میں داخل نہ ہو رہے ہوں۔ مسلمانوں کو تو یہ توفیق بھی نہ ہو سکی کہ وہ کوئی ایسی ایجنسی قائم کرتے جو ان نومسلین کے اعداد و شمار جمع کر کے شائع کرتی۔ البتہ عالمی ادارہ مذہب World Religions Institute نے حال میں کچھ اعداد و شمار شائع کئے ہیں۔ اس میں بتایا گیا ہے کہ ۱۹۷۱ سے ۱۹۷۵ء تک کے پانچ سالوں میں تقریباً پانچ لاکھ آدمیوں نے اسلام قبول کیا۔ یہ اعداد و شمار صرف یورپ اور امریکہ سے متعلق ہیں۔ افریقہ میں مسلمانوں کی پس ماندگی اور عیسائی مشنریوں کی غیر معمولی جد و جہد کے باوجود عیسائی بننے والوں کے مقابلہ میں اسلام قبول کرنے والوں کی تعداد کہیں زیادہ ہے۔ السٹریٹڈ ویکلی کے سابق ایڈیٹر مسٹر خوشونت سنگھ نے اپنے افریقی دورہ کے تاثرات کے ذیل میں لکھا تھا:

"کینیا اور یوگنڈا کے اپنے آخری سفر میں میں نے عیسائیوں اور مسلمانوں کی ان تبلیغی کوششوں کا جائزہ لیا جو نیگرو قبائل کے درمیان جاری ہیں۔ عیسائیوں نے تسلیم کیا کہ مسلم عرب بردہ فروشوں کی ناخوش گوار یادوں کے باوجود افریقہ کے سیاہ فام باشندوں میں اسلام قبول کرنے والوں کی تعداد عیسائی بننے والوں سے زیادہ ہے"

(السٹریٹڈ ویکلی آف انڈیا۔ ۷ جولائی ۱۹۷۴ء، صفحہ ۲۷)

اگرچہ ہمارے پاس قطعی اعداد و شمار نہیں ہیں تاہم یہ اندازہ مبالغہ آمیز نہیں کہ آج بھی کسی خاص تبلیغی کوشش کے بغیر دنیا بھر میں جو لوگ مسلمان ہو رہے ہیں ان کی تعداد سالانہ دو لاکھ سے زیادہ ہے۔ اگر ان نومسلموں سے روابط قائم کئے جائیں اور ان سے معلوم کیا جائے کہ اسلام کی کون سی خصوصیت نے انھیں متاثر کیا اور پھر ان معلومات کی روشنی میں عالمی سطح پر اسلام کی اشاعت کی منصوبہ بندی کی جائے تو صرف دس برس میں اسلام کی سربلندی کا وہ خواب پورا ہو سکتا ہے جس کو دوسری راہوں سے دو سو برس سے حاصل کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے مگر وہ حاصل نہیں ہوتا۔

نوٹ: یہ مقالہ ایک تقریر پر مبنی ہے جو ندوۃ المجاہدین کیرلا کے اجلاس بمقام ملاپورم ۱۱ مارچ ۱۹۷۹ کی گئی۔

اسلام کی نظریاتی طاقت

۱۹۴۸ کا واقعہ ہے۔ میرے بڑے بھائی عبدالعزیز خاں (پیدائش ۱۹۲۰) کے پیٹ میں سخت درد اٹھا۔ ڈاکٹر انیس اس وقت اعظم گڑھ میں سول سرجن تھے۔ ان کو بلایا گیا۔ انھوں نے دیکھ کر بتایا کہ یہ اپنڈکس کا کیس ہے اور اس کا علاج صرف آپریشن ہے۔ اس کے بعد انھوں نے مشورہ دیا کہ ان کو فوراً لکھنؤ لے جایئے۔" اپنڈکس کا آپریشن تو اس زمانہ میں معمولی آپریشن سمجھا جاتا ہے" میں نے کہا "پھر اس کے لئے آپ ہم کو لکھنؤ کیوں بھیج رہے ہیں۔ یہیں اعظم گڑھ کے اسپتال میں کیوں آپریشن نہیں کر دیتے۔"

ڈاکٹر انیس میری یہ بات سن کر سنجیدہ ہو گئے۔ "آپ صحیح کہتے ہیں" انھوں نے کہا "مگر مسئلہ یہ ہے کہ یہاں ہمارے پاس تربیت یافتہ ہیڈ (کارکن) نہیں ہیں۔ مثال کے طور پر ہم نے پیٹ میں شگاف ڈالنے کے بعد اپنا کام کر لیا اور چاک کو دوبارہ سینے کا وقت آیا تو ہمارے پاس ایسے ماہر آدمی ہونے چاہئیں جو خود سے یہ جان لیں کہ ہمیں کس قسم کے دھاگے کی ضرورت ہے۔ اگر ہم کو پتلے دھاگے کی ضرورت ہو اور ہمارے پاس کھڑا ہوا آدمی موٹا دھاگا سوئی میں ڈال کر ہمیں دینے لگے تو سارا کام خراب ہو جائے گا، کیوں کہ یہ بے حد نازک لمحہ ہوتا ہے۔ ہمارے پاس اتنا وقت نہیں ہوتا کہ ہم اپنے ساتھی کے کام کو دیکھیں اور جب وہ غلط دھاگہ ڈالے تو ہم کہیں کہ دیکھو موٹا دھاگا مت دینا، پتلا دھاگا دینا۔ اس کو بتائے بغیر جاننا چاہئے کہ ایک کے بعد دوسرا کون سا عمل کیا جانے والا ہے اور اس میں اس کو کیا حصہ ادا کرنا ہے۔" سول سرجن نے اپنی گفتگو اس جملہ پر ختم کی ——— "میرے ساتھی کو جاننا چاہئے کہ میں آئندہ کیا کرنے والا ہوں۔"

یہی بات ملت کی تعمیر کے لئے بھی صحیح ہے۔ ہر زمانہ میں ایسے حالات پیدا ہوتے ہیں جو قوم کے لئے اپنی منزل کی طرف سفر کی نئی راہیں کھولتے ہیں۔ یہ حالات لاؤڈ اسپیکر پر اعلان کرتے ہوئے نہیں آتے۔ وہ عالم واقعات میں خاموشی کے ساتھ شامل ہو جاتے ہیں۔ یہ ملت کے افراد کا امتحان ہوتا ہے کہ کیا وہ اتنے حساس اور باشعور ہیں کہ خود سے جان لیں کہ خدائی اسکیم میں اپنا حصہ ادا کرنے کے لئے انھیں کیا کرنا چاہئے۔ اس وقت ملت کے افراد اگر پیشگی اپنے حصہ کا عمل جان لیں تو وہ صرف "۲۳" سال میں کامیابی کی بلندیوں پر پہنچ سکتے ہیں اور اگر وہ قدرت کے اشاروں کو نہ سمجھیں تو دوسری راہوں پر ۲۳ سو سال کا شور و غل بھی کوئی نتیجہ پیدا کرنے والا نہیں ہے۔

ایک مثال لیجئے۔ مکہ میں پیغمبر کی رہنمائی میں جو دعوت اٹھی اور مختلف واقعات کے جلو میں جس طرح اس کی آواز سارے ملک میں پھیل گئی، اس کے نتیجہ میں بعثت کے پندرھویں سال یہ صورت حال تھی کہ قدیم عرب کے ہزاروں لوگ دل سے اسلام کی حقانیت کو مان چکے تھے۔ مگر اس ڈر سے وہ اسلام قبول کرنے سے رکے ہوئے تھے کہ اگر انھوں نے اپنے اسلام کا اعلان کیا تو وہ سارے قریش سے اعلان جنگ کے ہم معنی بن جائے گا۔ یہ ایک بے حد نازک لمحہ تھا۔ ایک طرف قریش کی ایذا رسانی بے حد بڑھ چکی تھی۔ قریش نے مسلمانوں کو بیت اللہ سے روکا۔ ان کو ان کے گھروں اور

جائدادوں سے نکالا، ان کی معاشیات کو تباہ کیا۔ ان کو نیست و نابود کرنے کے لئے وحشیانہ لڑائیاں لڑیں۔ ان کے لئے امن کے ساتھ رہنا ناممکن بنا دیا۔ اس کے نتیجہ میں ایسا ہونا فطری تھا کہ مسلمانوں کے دل میں قریش کے خلاف نفرت اور دشمنی کی آگ بھڑک رہی ہو۔ مگر پیغمبر کی رہنمائی میں انھوں نے قدرت کے اشارہ کو پڑھ لیا۔ انھوں نے جان لیا کہ ربانی منصوبہ میں اس وقت انھیں جو حصہ ادا کرنا ہے وہ صبر ہے نہ کہ میدان مقابلہ میں شجاعت دکھانا۔ یعنی یہ کہ وہ جنگ و جدال کی صورت حال کو ہر قیمت پر ختم کر دیں تاکہ لوگ قریش سے جنگ مول لینے کے اندیشے سے مامون ہو کر اسلام کی طرف بڑھ سکیں۔ انھوں نے اپنی تلواروں کو یک طرفہ طور پر میان میں کر لیا اور قریش کے ظالمانہ مطالبات تک کو مان کر ان سے دس سال کا ناجنگ معاہدہ کر لیا۔ اس کے مطابق قریش پابند ہو گئے کہ وہ دس برس تک نہ مسلمانوں سے جنگ کریں گے اور نہ نئے اسلام میں داخل ہونے والوں سے۔ حدیبیہ کا معاہدہ (۶ھ) اللہ کی اسکیم میں اپنے کو شامل کرنے کا یہی معاملہ تھا۔ اگرچہ یہ ناقابل برداشت کو برداشت کرنا تھا۔ مگر جب مسلمانوں نے اللہ کے بھروسہ پر ایسا کیا تو اس کے نتائج ظاہر ہونا شروع ہوئے۔ جب یہ خبر پھیلی کہ قریش اور مسلمانوں کے درمیان یہ معاہدہ ہو گیا ہے کہ دونوں میں سے کوئی ایک دوسرے کے خلاف جنگ نہیں چھیڑے گا تو متاثر قبیلے قریش کی جارحیت سے بے خوف ہو کر اسلام میں داخل ہونا شروع ہو گئے۔ مسلمانوں کی تعداد بڑھنے لگی۔ معاہدۂ حدیبیہ کے وقت مسلمانوں کی جماعت چودہ سو افراد پر مشتمل تھی اور اس کے بعد صرف دو برس میں ان کی تعداد دس ہزار ہو گئی۔ اب طاقت کا توازن مسلمانوں کی طرف تھا۔ کسی خون خرابہ کے بغیر محض رعب و دبدبہ کے ذریعہ مرکز عرب (مکہ) پر ان کا قبضہ ہو گیا۔

یہی خدائی منصوبہ موجودہ زمانہ میں ایک اور صورت میں ظاہر ہوا ہے۔ پچھلے سو برس سے مسلمان دیگر قوموں سے لڑائی بھڑائی میں مشغول ہیں۔ ان قوموں سے مسلمانوں کو جو شدید تکلیفیں پہنچیں، اس کی وجہ سے مسلمانوں کو ان سے دشمنی اور نفرت پیدا ہو گئی اور انھوں نے ان کے خلاف جنگ چھیڑ دی۔ نتیجۃً خود ان قوموں کے اندر بھی مسلمانوں سے اور ان کی ہر چیز سے عناد بڑھتا چلا گیا۔ مگر عین اس وقت جب کہ یہ کشمکش کسی نتیجہ تک پہنچے بغیر جاری تھی، ساری دنیا میں ایک اور انقلاب ابھر آیا۔ یہ وہ فکری انقلاب ہے جو انیسویں صدی کے الحاد کے رد عمل کے طور پر پیدا ہوا ہے۔ موجودہ زمانہ میں تقابلی مطالعۂ ادیان، صنعتی تہذیب کے نتائج سے مایوسی، سائنس کی موافق مذہب دریافتیں اور دوسرے وجوہ سے ساری دنیا میں ایک نیا ذہن پیدا ہوا ہے۔ لوگ از سر نو مذہبی تعلیمات کا مطالعہ کرنا چاہتے ہیں۔ تاہم جدید مذہبی دلچسپیوں کی اس فہرست میں اسلام کا نام ابھی بہت پیچھے ہے۔ اس کی وجہ ہماری وہ لفظی اور غیر لفظی لڑائیاں ہیں جو ہم نے غیر مسلم قوموں سے ساری دنیا میں چھیڑ رکھی ہیں۔ نئے موافق امکانات دوبارہ قدرت کی خاموش زبان میں سو برس سے یہ اشارہ کر رہے ہیں کہ آج دوبارہ ایک "صلح حدیبیہ" کی ضرورت ہے۔ اللہ کے دین کو آج مجاہدانہ اقدام نہیں بلکہ صابرانہ پسپائی درکار ہے۔ وہ چاہتا ہے کہ ہم غیر مسلم اقوام کے خلاف اپنی تمام سیاسی اور احتجاجی سرگرمیاں یک طرفہ طور پر بند کر دیں۔ تاکہ طرفین کے درمیان تناؤ ختم ہو اور لوگ معتدل فضا میں اسلام کا مطالعہ شروع کر سکیں۔ اس طرح وہ قومیں جو آج اسلام کی حریف بنی ہوئی ہیں، اسلام کی مدعو بن جائیں گی۔ دور جدید نے اسلام کے حق میں جو

علمی تصدیقات فراہم کی ہیں وہ اپنا کام کرنا شروع کریں گی۔ ایک نسل بھی نہیں گزرے گی کہ وہ وقت سامنے آجائے گا جس کی پیشین گوئی حدیث میں ان الفاظ میں کی گئی ہے ـــــ "کوئی خیمہ یا مکان ایسا نہیں بچے گا جس میں اسلام داخل نہ ہو گیا ہو۔"

نئے امکانات

موجودہ زمانہ میں اسلام کی دعوت و اشاعت کے جو امکانات پیدا ہوئے ہیں، ان میں سے چند یہ ہیں:

۱۔ یہ دریافت کہ ساری کائنات کا مادہ ایک ہے اور وہ ایک قانون کے تحت چل رہی ہے، اس سے توحید کا عقیدہ آج کے انسان کے لئے ہمیشہ سے زیادہ قابل فہم بن گیا ہے۔

۲۔ بہت سی دریافتیں ہیں جنھوں نے آخرت کو قابل فہم بنا دیا ہے۔ مثلاً ٹیلی وژن کے ذریعہ اس بات کا قابل فہم ہو جانا کہ موجودہ دنیا کے اندر ایک اور دنیا موجود ہو سکتی ہے اگرچہ وہ ظاہری آنکھوں سے دکھائی نہ دیتی ہو۔

۳۔ یہ دریافت کہ انسان اپنی محدودیتوں کی وجہ سے صرف جزئی علم تک پہنچ سکتا ہے، اس سے وحی و الہام کی اہمیت ثابت ہو جاتی ہے۔

۴۔ موجودہ زمانہ میں مذاہب کے تقابلی مطالعہ نے ثابت کیا ہے کہ تمام مذاہب میں اسلام ہی واحد مذہب ہے جس کو تاریخ کی اعتباریت حاصل ہے۔

۵۔ سیاسی ادارہ کو مذہبی عقیدہ سے جدا کرنے کا کام جو اسلام کے ابتدائی زمانہ میں شروع ہوا تھا، اس کو مغرب کے فکری انقلاب نے تکمیل تک پہنچا دیا ہے۔ آج توحید کی دعوت کو ان غیر ضروری مشکلات سے آزاد رہ کر انجام دیا جا سکتا ہے جو قدیم زمانہ کی مشرکانہ بادشاہت کی وجہ سے پیش آتی تھیں۔

۶۔ جدید جمہوری انقلاب نے ساری دنیا میں آزادی اظہار خیال کو انسان کا فطری حق ثابت کیا ہے۔ اس نے تاریخ میں پہلی بار یہ امکان پیدا کیا ہے کہ توحید کی دعوت کو سیاسی ٹکراؤ کے بغیر جاری کیا جا سکے۔

۷۔ پریس کی ایجاد، مواصلاتی ذرائع کی ترقی اور ابلاغ عامہ کے جدید طریقوں کا ظہور میں آنا۔ ان چیزوں نے اس بات کو ممکن بنا دیا ہے کہ جدید ذرائع کو استعمال کر کے بے حد وسیع پیمانہ پر اسلام کی اشاعت کی جا سکے۔

۸۔ جدید اقتصادی صورتوں نے مسلمانوں کو ہر خطہ زمین پر پہنچا دیا ہے۔ ان مسلمانوں کو منظم کر کے اسلام کی دعوت کو بیک وقت عالمی سطح پر شروع کیا جا سکتا ہے جو اس سے پہلے کبھی ممکن نہ ہوا تھا۔

۹۔ موجودہ زمانہ میں بے شمار نئی تحقیقات سامنے آئی ہیں جو اسلام کی مؤید ہیں۔ ان کو استعمال کر کے اسلامی علم کلام کو خالص حقائق کی بنیاد پر مرتب کیا جا سکتا ہے جو قدیم قیاسی علم کلام کے مقابلہ میں بے شمار گنا زیادہ طاقت ور ہو گا۔

۱۰۔ صحیح فلسفہ اور بہتر زندگی پانے کی بے شمار کوششوں کے بعد آج کا انسان مایوسی کے مقام پر کھڑا ہوا ہے۔ اس صورت حال نے اس بات کا امکان پیدا کر دیا ہے کہ اسلام کو سب سے صحیح تر نظریہ کی حیثیت سے سامنے لایا جائے اور آج کا انسان اس کو اپنے دل کی آواز پا کر قبول کرے۔

چند مثالیں

بیسویں صدی کے آغاز میں یہ بات واضح ہو چکی تھی کہ یورپ اپنی تمام مادی ترقیوں کے باوجود ایک احساس ناکامی سے دوچار ہے۔ اس کو نظر آرہا ہے کہ اس کی سائنس اور ٹکنولوجی نے اس کو مشینیں اور سواریاں تو دیں، مگر اس کو وہ فلسفۂ حیات نہ مل سکا جو اس کو یقین کی دولت عطا کرتا۔ انگریز فلسفی بریڈلے (۱۸۴۶ - ۱۹۲۴) نے موجودہ صدی کے ربع اول میں کہا تھا:

"دنیا کو ایک نئے مذہب (New religion) کی ضرورت ہے۔ ہمیں ایک ایسا عقیدہ چاہئے جو تمام انسانی مفادات کا تعین کرے اور ضروری تناسب کے ساتھ اس کے جواز کی بنیاد ہو، اور اسی کے ساتھ وہ شعور عطا کرے جس سے انسان اس پر اعتماد کے ساتھ قائم ہو سکے۔"

Essays on Truth & Reality. p. 446

اس کے بعد خود مغربی ممالک میں ایسے لوگ اٹھے جنھوں نے مسلمانوں کو یاد دلایا کہ ان کے پاس خدا کی جو امانت ہے، وہ یورپ کی اس فکری کمی کو پورا کر سکتی ہے، وہ اس کو لے کر اٹھیں اور اہل عالم تک اس کو پہنچا کر اپنا خدائی فریضہ ادا کریں۔ لارڈ بی۔ ایچ۔ کے۔ لوتھین (۱۸۸۲-۱۹۴۰) چالیس سال پہلے ہندستان آئے تھے اور ۱۹۳۸ میں مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں تقسیم اسناد کے جلسہ کی صدارت کی تھی۔ اس موقع پر انھوں نے اپنے خطبہ میں کہا تھا:

"یورپ اپنے سیاسی، معاشی، تمدنی اور عائلی مسائل کا تسلی بخش حل دریافت کرنے میں ناکام ہو چکا ہے۔ آپ حضرات کا دعویٰ ہے کہ اسلام زندگی کا مکمل دستور العمل ہے اور اس میں اجتماعی مسائل کا بہترین حل موجود ہے۔ میں آپ کو مشورہ دیتا ہوں کہ آپ بلاد مغرب میں جاکر وہاں کے باشندوں کو اسلام کی تعلیمات سے آگاہ کریں۔" (خطبہ تقسیم اسناد)

پروفیسر منٹگمری واٹ (۱۹۰۹ -) نے اس سے بھی زیادہ واضح الفاظ میں مسلمانوں کی غیرت کو پکارا۔ پیغمبر اسلام کی سیرت پر اپنی کتاب میں انھوں نے لکھا:

"دنیا بہت تیزی سے ایک ہوتی جا رہی ہے اور اس ایک دنیا میں یہ رجحان بڑھ رہا ہے کہ اس کے اندر اتحاد اور یکسانیت ہو۔ اس رجحان کی وجہ سے یقیناً وہ دن آئے گا جب کہ یہاں اخلاقی اصولوں کا ایک ایسا نظام ہوگا جو نہ صرف عالمی جواز رکھتا ہوگا بلکہ فی الواقع وہ ساری دنیا میں تسلیم کیا جا چکا ہوگا۔ مسلمانوں کا دعویٰ ہے کہ محمدؐ تمام نوع انسانی کے لئے ایک عملی اور اخلاقی نمونہ ہیں یہ کہہ کر وہ دنیا کو دعوت دے رہے ہیں کہ وہ ان پر رائے قائم کر سکے۔ اب تک یہ معاملہ دنیا کی بہت کم توجہ اپنی طرف مائل کر سکا ہے۔ مگر اسلام کی قوت کی وجہ سے یہ بالآخر اہمیت حاصل کرے گا۔ اب سوال یہ ہے کہ کیا محمدؐ کی زندگی اور تعلیمات میں سیکھنے کے قابل کچھ اصول ہیں جو مستقبل کی دنیا کو واحد اخلاقی نظام عطا کر سکیں

دنیا کو ابھی تک اس سوال کا آخری جواب نہیں دیا گیا ہے۔ مسلمانوں نے محمدؐ کے بارے میں اپنے دعوے کی تائید میں اب تک جو کچھ کہا ہے، وہ اس سلسلہ میں بس ایک ابتدائی بیان کی حیثیت رکھتا ہے اور بہت کم غیر مسلم

اس سے مطمئن ہو سکے ہیں۔ تاہم یہ موضوع ابھی کھلا ہوا ہے۔ دنیا کا ردعمل محمدؐ کے بارے میں کیا ہوتا ہے، کسی حد تک اس پر منحصر ہے کہ آج کے مسلمان اس کے لئے کیا کرتے ہیں۔ انھیں اب بھی یہ موقع حاصل ہے کہ بقیہ دنیا کے سامنے اپنے مقدمہ کو زیادہ بہتر اور مکمل طور پر پیش کریں۔ کیا مسلمان یہ دکھا سکیں گے کہ ایک متحدہ دنیا کی اخلاقیات کے لئے محمدؐ کی زندگی ایک آئیڈیل انسان کی حیثیت رکھتی ہے۔ اگر مسلمان اپنے مقدمہ کو بہتر طور پر پیش کر سکیں تو عیسائیوں میں وہ ایسے لوگ پائیں گے جو اس کو سننے کے لئے تیار ہیں" (صفحہ ۳۳۴)

Montgomery Watt, *Mohammad As Model For Universal Morality*

اس طرح کی بہت سی مثالیں پیش کی جا سکتی ہیں۔ مگر کیسی عجیب بات ہے۔ مسلمان اس پوری مدت میں مغربی قوموں سے سیاسی لڑائی تو لڑتے رہے جس میں مغرب صریح طور پر ان کے اوپر برتری رکھتا تھا۔ مگر فکری اور اعتقادی میدان، جو مغربی قوموں کا کمزور گوشہ تھا، وہاں ان پر کوئی جدوجہد نہ کی۔ نادانی کی ایسی عجیب غریب مثال شاید پوری تاریخ میں کوئی دوسری نہیں ملے گی۔

فکری اور نظریاتی طاقت کی اہمیت کیا ہے، اس کی ایک مثال یہاں ہم خود جدید مغربی تاریخ سے پیش کریں گے۔ پہلی جنگ عظیم (۱۸-۱۹۱۴) کے دوران روس میں کمیونسٹوں کا غلبہ برطانیہ عظمیٰ کے لئے ایک سوالیہ نشان تھا۔ کیونکہ یہ برطانوی سلطنت کے "مشرقی حصہ" کے لئے خطرہ کے ہم معنی تھا۔ نومبر ۱۹۱۸ء میں انگریز فوجی افسروں کا ایک وفد صورت حال کا جائزہ لینے کے لئے سمرقند پہنچا۔ اگرچہ بظاہر یہ بتایا گیا تھا کہ یہ ایک تجارتی وفد ہے اور وسط ایشیا کی کپاس کا سودا کرنے جا رہا ہے۔ وفد کے ممبران یہ تھے:

کرنل بیلی	F.M. Bailey
کرنل ایتھرٹن	P.T. Etherton
میجر بلیکر	L.V.S. Blacker

واپسی کے بعد کرنل ایتھرٹن نے ایک کتاب لکھی جس کا نام ہے "وسط ایشیا کے قلب میں"

In The Heart Of Central Asia

انھوں نے اپنی اس کتاب میں جو باتیں لکھیں، ان میں سے ایک یہ تھی:

The new set of ideas of the Bolsheviks was potentially much more of a menace to English domination in the Orient than all the Czar's armies in the past.

یعنی بالشویکوں کے نظریات بالقوہ طور پر برطانیہ کے مشرقی مقبوضات کے لئے اس سے زیادہ بڑا خطرہ ہیں جتنا کہ ماضی میں زار کی تمام فوجیں ہو سکتی تھیں۔ (۹۳-۹۲) اسلام جو رب العالمین کا بھیجا ہوا دین ہے، اس کی نظریاتی طاقت دوسرے تمام نظریات سے بے شمار گنا زیادہ ہے۔ اگر مسلمان اس کو لے کر اٹھیں تو ان کا تسخیری سیلاب اتنا بے پناہ ہوگا جس کے مقابلہ میں "بڑی طاقتوں" کی تمام فوجیں بھی عاجز ہو کر رہ جائیں۔

دنیا کی موجودہ آبادی تقریباً چار ارب ہے۔ ان میں سے دو آدمی ہر سکنڈ میں مرجاتے ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ہر ۲۴ گھنٹے میں تقریباً ایک لاکھ ۷۳ ہزار آدمی اس دنیا سے رخصت ہو رہے ہیں تاکہ خدا کے دربار میں حاضر ہو کر یہ گواہی دیں کہ باخبر کرنے والوں نے ہم کو حقیقت سے باخبر نہیں کیا —— کیسے عجیب ہیں وہ لوگ جو کروڑوں انسانوں سے ان کی آخرت چھین رہے ہیں۔ مگر خود اپنے بارہ میں انھیں یقین ہے کہ ان کی آخرت کسی حال میں چھننے والی نہیں۔

وہ شہر کی ایک پُر رونق سڑک کے کنارے کھڑا تھا۔ لوگ پیدل اور سواریوں پر ادھر سے اُدھر جاتے ہوئے دکھائی دے رہے تھے۔

"یہ نازک چہرے، یہ خوب صورت جسم، یہ ہنستی ہوئی مورتیں مرنے کے بعد بھڑکتی ہوئی آگ میں ڈال دی جائیں گی" یہ سوچ کر بے اختیار اس کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔

اور پھر ایک آہ کے ساتھ اس کی زبان سے وہ الفاظ نکلے جن کو انسانوں کے سوا پوری کائنات نے سنا: "کیا اس سے بڑی کوئی بات ہے جس کے لئے آدمی تڑپے، کیا اس سے بڑی کوئی خبر ہے جس کو بتانے والے دوسروں کو بتائیں۔"

کیسی عجیب بات ہے۔ آدمی اُسی بات سے بے خبر ہے جس کو اسے سب سے زیادہ جاننا چاہیے۔ اُسی خبر کو دوسروں تک پہنچانے کے لئے کوئی نہیں اٹھتا جس کو سب سے زیادہ دوسروں تک پہنچانے کی ضرورت ہے۔

عصری اسلوب میں اسلامی لٹریچر



- دین کیا ہے
  صفحات ۳۲ قیمت ۱/۵۰ روپے
- تجدید دین
  صفحات ۴۸ قیمت -/۲ روپے
- مذہب اور جدید چیلنج
  صفحات ۲۲۴ قیمت ۱۳/۵۰ روپے
- تعمیر ملت
  صفحات ۴۸ قیمت -/۲ روپے
- الاسلام
  صفحات ۱۷۶ قیمت -/۱۲ روپے
- اسلام دین فطرت
  صفحات ۴۸ قیمت -/۲ روپے
- ظہور اسلام
  صفحات ۲۰۰ قیمت -/۱۲ روپے
- زلزلۂ قیامت
  صفحات ۶۴ قیمت -/۳ روپے
- اسلامی دعوت
  صفحات ۴۸ قیمت -/۲ روپے
- تاریخ کا سبق
  صفحات ۴۸ قیمت -/۲ روپے
- عقلیات اسلام
  صفحات ۴۸ قیمت -/۲ روپے
- قرآن کا مطلوب انسان
  صفحات ۸۰ قیمت -/۴ روپے

مکتبہ الرسالہ
جمعیۃ بلڈنگ قاسم جان اسٹریٹ دہلی ۱۱۰۰۰۶

MAKTABA AL-RISALA ● JAMIAT BUILDING ● QASIMJAN STREET ● DELHI 110006

Regd R. N. No. 28822/76
Issue No. 32

Regd. No. D. (D) 532
July 1979

Al-Risala Monthly

Jamiat Building, Qasimian Street, DELHI-110006 (INDIA)

اِسے آپ کب لیں؟

جب گرمی کے دنوں میں ...
آپ بدن میں آگ سی محسوس کریں ...
آپ کو پیاس بار بار ستارہی ہو ...
دل و دماغ پر اُکتاہٹ سی طاری ہو ...
آپ کو تھکاوٹ کا احساس ہو ...

تب آپ شربت روح افزا لیجیے

شربت روح افزا میں ٹھنڈک پہنچانے والی ١٦ جڑی بوٹیوں اور پھلوں کے رس کا مزے دار شربت ہے جو فرحت اور تازگی پہنچاتا ہے۔ پیاس میں سکون دیتا ہے اور افسردگی اور تھکن کو دُور کرتا ہے۔
روح افزا ایک بہترین شربت ہے، جسے آپ دودھ، لسی اور آئس کریم میں بھی ملا کر لذت اندوز ہو سکتے ہیں۔
آج ہی شربت روح افزا کی بوتل خریدیے۔

ہمدرد

شربت رُوح افزا

گرمیوں میں سب کی ضرورت، سب کی پسند



ثانی اثنین خاں پرنٹر پبلشر مسئول نے جے کے آفسیٹ پرنٹرز دہلی سے چھپوا کر دفتر الرسالہ جمعیۃ بلڈنگ قاسم جان اسٹریٹ دہلی سے شائع کیا